

مرتبہ :- عتیق جاذب بی کام

معاون :- سہیل عرفان



اردو اسوسیشن، وانمباڑی

مشاعرہ

جھلکیاں

واہ واہ اور دوبارہ ارشاد کی صداؤں سے بے نیاز
ایک خیالی مشاعرہ جس میں وانمباڑی کے تقریباً
تیس شاعر شریک ہیں

مرتبہ:-
عتیق جاذب بی کام

معاون:-
سہیل عرفان

اردو اسوسیشن، وانمباڑی

ایک جھلک

جھلکیوں کے لئے سب سے پہلے مجھے ان احباب کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ جنہوں نے اس کتاب کے لئے میری ہمت افزائی کی اور میرا ساتھ دیا۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ ان لوگوں تک جاتے آتے میرے جوتے گھس گئے تھے اور اس طرح کا سب سے زیادہ کرم تو ہمارے سبیل عرفان صاحب نے کیا۔ کبھی گھر پہنچتا ہوں تو خبر ملتی ہے کہ "ابھی ابھی سوئے ہیں" اور کبھی آپ خود آکر اطلاع دیتے ہیں کہ "ابھی ابھی جاگا ہوں" یہ وانمباڑی کے بہترین افسانہ نگاروں میں سے ہیں۔ اور جدید افسانوں میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔ آپ نے اپنی ساری مصروفیتوں کے باوجود اس کتاب کو سنوارنے میں بڑی مدد کی ہے۔

غرض کتاب پیش خدمت ہے۔ امید ہے کہ میری اس پہلی کوشش کو آپ پسند کرینگے۔ دلچسپی بڑھانے کے لئے طنز و مزاح کا انداز اپنانا پڑا۔ اگر کوئی بات گراں بھی گذرے تو نظرانداز کر دیجئے۔

فقط
جاذب

وانمباڑی
۱۱ مارچ ۱۹۷۱ء

شریکِ مشاعرہ



مدینہ برقی پریس مدراس ۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مجھے شاعروں کا بڑا شوق ہے۔ میں بھی غزلیں سناتا ہوں مگر اپنی نہیں کبھی کبھی کسی کی۔ اشعار چراتا بھی ہوں تو اس احتیاط اور اس مہارت سے چراتا ہوں کہ خود شاعر کو پتہ نہیں چلتا کہ اس کا سرمایہ چوری ہو گیا ہے۔ بسا اوقات یوں بھی ہوا ہے کہ ایسے شعرائے کرام سے بھی میں نے چند اشعار پر دادِ تحسین لی ہے، جو انھیں کے نتیجۂ فکر رہے ہیں۔ میں ہر وقت ایسی غزلوں اور نظموں کی تلاش میں رہتا ہوں جو غیر مطبوعہ ہوں۔ خصوصاً ہر چھوٹے بڑے مشاعرے میں میری شرکت ضروری ہے۔ اکثر شعرائے کرام اپنی تازہ ترین تخلیقات مشاعروں ہی میں میری نذر کرتے ہیں۔ چنانچہ ہر وقت مجھ پر مشاعرہ سوار رہتا ہے۔ میں اٹھتے، بیٹھتے، سوتے جاگتے مشاعروں کے خواب دیکھتا رہتا ہوں۔ ابھی چند دن پیشتر کا واقعہ ہے، کہ میں نے سنا وانمباڑی میں مقامی شعراء اونچے پیمانے پر مشاعرہ برپا کرنے والے ہیں۔ بس میں نے بھی اپنی سرگرمیاں شروع کر دیں اور تاریخ و مقام کا پتہ لگا کر وقتِ مقررہ سے ایک دن پہلے ٹرین پر سوار ہو گیا۔ چونکہ آنے والی رات آنکھوں میں کاٹنی تھی، اس لئے برتھ پر قبضہ جما کر لیٹ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں آنکھ لگ گئی۔ شاید وہ خواب ہی تھا۔ کیوں کہ میں نے محسوس کیا کہ اچانک مشاعرے

میں پہونچ گیا ہوں۔ چاروں طرف بھاری مجمع ہے اور اسٹیج پر حضرت مرزا اسداللہ خاں غالب تشریف فرما ہیں۔ سفید لباس میں ملبوس، ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ اور آنکھوں میں بھرپور شرارت، پیشانی پر مبہم لکیریں اور چہرے پر تکونی داڑھی۔ سراپا عجز و انکسار آپ خاموش سے سر جھکائے بیٹھے ہیں۔ اور دائیں بازو علامہ گردش بیٹھے ہیں۔ جو اناؤنسر کی حیثیت سے بدنام زمانہ ہیں۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ مشاعرے کے چھ گھنٹوں میں چار گھنٹے اپنے تعارفی کلام میں صرف کرتے ہیں۔ اور ہر غزل کے بعد اپنا ایک فی البدیہہ شعر ضرور سناتے ہیں۔ کوئی صاحب قرأت پڑھ رہے تھے۔ قرأت ختم ہونے کے بعد اناؤنسر صاحب نے کسی مخدوم اشرف صاحب کو نعت پڑھنے کے لئے بلایا۔ اشرف صاحب آئے اور نعت سنانے لگے۔

نہ دیکھیں گے کسی کو کوئے سرور دیکھنے والے
جمالِ گنبدِ خضرا کا منظر دیکھنے والے
ہجومِ جلوہ ہے ہر سمت ہر سُو نور کی بارش
سراپا محوِ حیرت ہیں یہ منظر دیکھنے والے
کہاں کا گلستاں، کیسی بہاروں کی گل افشانی
بھلا دیتے ہیں سب اللہ کا گھر دیکھنے والے
جو سچ پوچھو تو خاکِ طیبہ اکسیر فضیلت ہے
یہاں آئیں بلندی پر مقدر دیکھنے والے

وہ روضے کی چمکتی جالیاں وہ بام و در روشن
منور دل کو کر لیتے ہیں اکثر دیکھنے والے
بفیضِ زندگی ہی دیکھ لیں آ کر مدینے میں
نگاہِ شوق سے جنّت کو مر کر دیکھنے والے
نہ دیکھیں گے دہکتی آگ دوزخ کی کبھی اشرفؔ
حضورِ پاکؐ کا روئے منوّر دیکھنے والے

نعت کے بعد حضرتِ غالبؔ نے صدارتی تقریر کا آغاز کیا۔

لیلئِ اردو کے دیوانو!

مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہو رہی ہے کہ آج کل کے اس بحران میں بھی آپ حضرات نے اردو کا دامن بڑی مضبوطی سے تھام رکھا ہے۔ چند سالوں پیشتر مجھے ایک مشاعرے میں شرکت کے لئے جنت سے دو دن کی چھٹی لیکر آنا پڑا تھا۔ لیکن یقین مانئے کہ مشاعرے میں شریک ہو کر وہ کوفت ہوئی کہ آیندہ جنّت سے باہر قدم نہ نکالنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ شاعری میں جدّت پسندی یا جدید شاعری کے نام سے لوگوں نے اس صنف کا وہ مذاق اڑا رکھا ہے کہ بس پوچھو نہیں۔ آپ کا دعوت نامہ مجھے اس وقت ملا جب میں خود جنت کی فضا سے اکتا گیا تھا!۔

بہر حال مجھے امید ہے کہ آپ اپنے وعدے کے مطابق جدید شاعری کے نام پر الٹی سیدھی سنا کر میرے ذہن کا امتحان

نہ لیں گے۔ مجھے بھی چوڑی تقریر تو نہیں کرنی ہے۔ اِدھر دو چار دن سے مسلسل راتیں جگ کر گذاری ہیں۔ بہت تھکا ہوا ہوں۔ انشاءاللہ مشاعرے کے اختتام پر اگر کچھ کہہ سکوں گا تو کہہ لوں گا۔ آپ لوگوں کا جوش وخروش دیکھ کر مجھے یہ اندیشہ ہو رہا ہے کہ کہیں مشاعرہ اتنا دلچسپ نہ ہو جائے کہ پھر واپس جنت میں جانے کو دل نہ چاہے۔

بہر حال اب مشاعرے کا آغاز کیا جائے۔ حضرت غالب اتنا کہہ کر پیچھے کھسک گئے۔ اور سر جھکائے خاموش ...

پھر گردش صاحب (اناؤنسر) نے مائک ٹھیک کیا اور کہنے لگے۔ جناب صدر! شعرائے کرام اور حاضرین۔ گذشتہ دو چار مشاعروں سے مجھے یہ اندازہ ہو چلا ہے کہ آپ لوگوں پر میری اناؤنسری گراں ثابت ہو رہی ہے۔ میں کئی کئی دن محنت کر کے اناؤنسری کا مواد جمع کروں، اُسے حفظ کروں اور کئی بار ریہرسل کر کے آپ لوگوں کے سامنے آؤں اور آپ مجھے گالیاں دیں یہ میرا ضمیر گوارا نہیں کرتا اس لئے میں آج ایک بالکل نیا انداز اپناؤں گا۔ اور امید کرتا ہوں کہ آپ لوگوں کو بھی یہ طریقہ پسند آئے گا۔ تو لیجئے سب سے پہلے میں وانمباڑی کے اس مشہور شاعر کو دعوت دیتا ہوں جو شاید میرے ہی لئے کہتا ہے۔

رسوائیوں کی حد میرے رنج و محن سے پوچھ!
آنکھوں کو دیکھ ، ماتھے کی ہر اک شکن سے پوچھ
ہر سانس اک چبھن ہے ضیا اس چبھن سے پوچھ
دوزخ کی کیا جلن ، مرے دل کی جلن سے پوچھ

میرا مطلب جناب ملک ضیا صاحب سے ہے۔ آپ چمڑے کے تاجر ہیں۔ شاعری کے میدان میں بہت پرانے ہیں۔ خیالات میں بلندی اور اندازِ بیان میں خوش اسلوبی آپ کے اشعار کی جان ہے۔ قریب میں آپ کا مجموعۂ کلام "تاجِ قمر" کے نام سے شائع ہونے والا ہے۔ ملک ضیا صاحب تشریف لائیں

ایک طرف سے سڈول اور فربہ جسم والے ایک صاحب آئے اور ایک غزل سنانے لگے۔ پست قد، قمیص، لنگی اور سر پر ٹوپی موٹے موٹے گال جسم کا لحاظ کرتے ہوئے آواز بالکل پست۔ جب ترنم چھیڑنے لگے تو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی فلمی گانے کی دھن سنا رہے ہیں۔ ؎

راہِ دشوار محبت سے گذرنا ہی مجھے
ڈوب کر گنگ کے دریا میں ابھرنا ہے مجھے

جیتے جی حسن کی ہر چاہ پہ مرنا ہے مجھے
عشق کا نام ہو اب کام وہ کرنا ہے مجھے

تیری صورت کی قسم، اپنے مقدر کی قسم
تجھ پہ جینا ہی نہیں تجھ ہی پہ مرنا ہے مجھے

جانِ من کچھ بھی نہیں جان کی فکر و پروا
ترا جو حکم بھی ہو جائے وہ کرنا ہے مجھے

نگہِ ناز کا ہو سحر نہ مجھ پر کہ ابھی
پائے جرأت کو رہِ شوق پہ دھرنا ہے مجھے

دیکھ کر تجھ کو کسی روز نہ اے حشر خرام
موت کو موت نہ آ جائے کہ مرنا ہے مجھے

بار بردارِ غم و رنج و الم کا ہوں ضیا
پُر خطر عشق کے جادہ سے گذرنا ہے مجھے

یہ مشاعرہ کی پہلی غزل تھی لوگ داد پر داد دے رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ اس میں سے کونسا شعر میرے کام آئے گا۔ میں نے پھر سوچا کہ ساری کی ساری غزل بھی میں چرا لوں تو مجھے کوئی پکڑ نہ سکے گا۔ کیوں کہ میں نے کئی

بار مشاعروں میں خمار بارہ بنکوی اور علامہ آہنگ کی غزل سنا کر خوب داد حاصل کی۔ گویا کسی کے فرشتوں کو بھی کچھ خبر نہ ہوئی۔

ملک ضیا صاحب نے اپنی دوسری غزل سنائی۔

جس کا آغوشِ کرم میں نے برابر پایا
آج کچھ اپنی طرف سے اُسے مضطر پایا

جس سے کی میں نے محبت اسے اکثر ہمدم
بے ادب شوخ اور گستاخ سراسر پایا ہے

بے سکوں دل ہی مِلا ہو تو سکوں ہو کیسے
جس کو دیکھا اُسے سیماب کا پیکر پایا ہے

جب ملے مجھ سے تو اس طرح ملے وہ مخلوص
ان کے مانند کوئی میں نے نہ دیگر پایا

عمر بھر چلتا رہا راہِ وفا پر قائم
نہ کوئی نقشِ قدم اور نہ رہبر پایا

قدر دانوں نے ضیا مجھ کو نہ جانے کیسے
لائقِ بزمِ سخن اور سخنور پایا !

غزل کے فوراً بعد حضرت گردش نے اپنا فی البدیہہ شعر کہا۔

جس سکوں کی تھی ہمیں زیست کے دامن میں تلاش
وہ سکوں ہم نے تری راہ میں مر کر پایا

پھر انھوں نے کہا۔

ظالم ترے ستم کو نہ بھولیں گے ہم کبھی
محشر میں تجھ کو خوب پشیماں کریں گے ہم

یہ جناب تشنہ عمری ہیں۔ عبدالرحمٰن خان تشنہ عمری ایم اے بی اوایل ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔ آپ ایک مدت سے لکچرار کی حیثیت سے قوم کی خدمت کر رہے ہیں۔ آپ نے اپنے سنجیدہ کلام

اور اپنے خاص اندازِ بیان سے شعرا میں ایک خاص مقام پیدا کر رکھا ہے۔ میں آپ سے درخواست کروں گا کہ اسٹیج پر تشریف لائیں۔

ایک بھاری بھرکم شخصیت، اونچا قد اور رعب دار چہرہ مائک پر نظر آئے۔ آپ نے غزل سنائی۔ آپ کی آواز بھی آپ ہی کی طرح بھاری اور رعب دار تھی۔

اب اپنی زندگی کا بھی ساماں کریں گے ہم
باطل کی قوتوں کو پریشاں کریں گے ہم

چھائی ہیں آسماں پہ اودی گھٹائیں آج
اب تو وصالِ یار کا ارماں کریں گے ہم

ظالم ترے ستم کو نہ بھولیں گے ہم کبھی
محشر میں تجھ کو خوب پشیماں کریں گے ہم

ہم اپنی ہمتوں کو جو لائیں بروئے کار
ذرّہ کو مثلِ ماہِ درخشاں کریں گے ہم

گردن جھکائیں گے ترے خنجر کے سامنے
یوں اپنے دل کے درد کا درماں کریں گے ہم

دریا کی مشکلات کا اب ہم کو کیا خطر
کشتی کو خود حوالۂ طوفاں کریں گے ہم

ہے تیر نازِ یار سے کس کو بھلا گریز!
زخموں سے اپنے دل کو گلستاں کرینگے ہم

رنگینیٔ حیات کے تشنہ ہیں اور اب
ہر دشت کو بھی جانِ بہاراں کرینگے ہم

گردش صاحب نے آپ کا یہ شعر دہرایا

دریا کی مشکلات کا اب ہم کو کیا خطر
کشتی کو خود حوالۂ طوفاں کریں گے ہم

اور پھر دوسری غزل کی فرمائش کی :

پھر تشنہ صاحب نے ایک نعتیہ کلام سنایا :

آپؐ سے اے شہِ عربؐ ولولہ کائنات میں
آپؐ سے پھیلی روشنی کعبہ و سومنات میں

آپؐ کا نام پاک ہے وردِ زبانِ ہر بشر
اور نگاہِ خیرہ ہے حسنِ تجلیات میں

آپؐ کا اے شہِ عجم رحم و کرم ہے بے کراں
ہے یہ کمال بھی عیاں آپؐ کے معجزات میں

لٹ گئے سارے بتکدے ظلمتِ دہر مٹ گئی
آپؐ سے انقلاب وہ آگیا کائنات میں !

آپؐ کے نور سے ہوئی ظلمتِ دہر کالعدم
نورِ خدائے پاک ہے آپؐ کی پاک ذات میں

آپؐ کی یاد اے نبیؐ میری زباں سے ہے محال
کلکِ سخن بھی محو ہے ذکرِ خصوصیات میں

آپؐ کے نام پاک سے روح کو چین ہے نصیب
تشنہ رخنہ جان کو اب تک ہی نہیں نجات ہیں

پھر اناؤنسر صاحب نے کہا :

اب اس بلند خیال کے شاعر کو سنئے جو کہتا ہے :

گردش کائنات رک جائے	آپ آئیں تو رات رک جائے
نغمہ زندگی مچل اٹھے	اور ہر ایک بات رک جائے

یہ جناب یعقوب اسلم صاحب ہیں۔ علامہ ماہر احسن گنوری کے بے حساب شاگردوں میں سے ایک ہیں۔ منشی فاضل، ادیب کامل کے سند یافتہ، ہائی سکول کے مدرس، اشعار کہنے میں اپنا خاص کمال رکھتے ہیں۔ اپنے تجربات کا اظہار بڑی خوبی اور جرات سے کرتے ہیں۔ اکثر رسالوں میں آپ کی غزلیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ آواز بڑی دلکش اور پیاری پائی ہے۔ ترنم سے سنائیں تو ساری محفل پھڑک اٹھے، مگر غضب تو یہ ہے کہ کبھی ترنم سے نہیں سناتے۔ یعقوب اسلم صاحب تشریف لائیں۔

میں نے دیکھا ایک جوان عمر شخص، لمبی قمیص اور پاجامے میں صورت بالکل شوکت تھانوی جیسی نہیں داڑھی۔ آنکھوں پر چشمہ مسکرانے کی کافی سے زیادہ کوشش کرتے ہوئے اسٹیج کی جانب بڑھ رہا ہے۔

آپ نے غزل سنائی : ؎

ہم کو بگڑے ہوئے حالات بنا دیتے ہیں
ہم بھٹکتے ہیں تو غم راہ دکھا دیتے ہیں
وہ جگہ دیر و حرم سے کبھی بڑی ہوتی ہے
ہم عقیدت سے جہاں سر کو جھکا دیتے ہیں
پتے پتے کو لہو دے کے کیا ہم نے جواں
کتنے ویرانے اسی طرح سجا دیتے ہیں
لٹ گئی ہیں تو کوئی پوچھنے والا بھی نہیں
لوگ سیتا پہ بھی الزام لگا دیتے ہیں
بجلیاں آگ لگانے کے لئے کیا کم تھیں
اور کچھ لوگ بھی شعلوں کو ہوا دیتے ہیں
اس طرح ہم کو مٹاتے ہیں زمانے والے
جیسے ناکردہ گناہوں کی سزا دیتے ہیں
کوئی آئے کہ نہ آئے شبِ غم اے اسلم
ہم بہر حال چراغوں کو جلا دیتے ہیں

بجلیوں والے شعر کو حضرتِ گردش نے دہرایا:
بجلیاں آگ لگانے کیلئے کیا کم تھیں
اور کچھ لوگ بھی شعلوں کو ہوا دیتے ہیں

اور پھر اسکی پیروڈی بنادی:
عورتیں آگ لگانے کے لئے کیا کم تھیں
اور کچھ مرد بھی شعلوں کو ہوا دیتے ہیں

۵ پھر اسلم صاحب نے اپنی دوسری غزل سنائی :

تاریکیوں کے قصر کو ڈھالوں تو کچھ کہوں
اک شمع رہگزر پہ جلالوں تو کچھ کہوں

ویراں ہیں مدتوں سے خیالوں کے بتکدے
اصنام فکر و فن کے سجالوں تو کچھ کہوں

فردوس کب بنے گی زمیں مجھ سے کچھ نہ پوچھ
انسان آدمی کو بنالوں تو کچھ کہوں

جب آ گیا ہوں در پہ ترے عرض حال کو
پہلے کچھ اشک غم بھی بہالوں تو کچھ کہوں

انسانیت پہ ہوتے ہیں کیوں روز تازہ جور
ایوان نخوتوں کے ہیں ڈھالوں تو کچھ کہوں

بنتی ہے زندگی تو دعاؤں کے فیض سے
پاؤں کوئی غریب دعالوں تو کچھ کہوں

ارماں کو نیند آئی ہے اسلم ابھی ابھی!
اب ان کی یاد کو بھی سلالوں تو کچھ کہوں

پھر جناب گردش سنتے تھے
اب اس شاعر کو سنئے جو کہتا ہے :

بزم ہستی کا ہر اک رنگ تھا نظارا طلب
اس کو کیا کہئے کہ جی بھر کے تماشا نہ ہوا

یہ حکیم مخدوم اشرف اشرف ہیں ۔ وانمباڑی کے مشہور حکیم جن کی شیشیوں میں ہر درد اور ہر مرض کی دوا ہے رہتی ہے ۔ جن کی انگلیاں تھرما میٹر اور جن کی آنکھیں ایکس رے کی مشین ۔ آپ کے کلام میں پختگی اور قدرتی رنگ پایا جاتا ہے ۔ غزل بہت اچھی کہہ لیتے ہیں ۔ اشرف صاحب تشریف لائیں ۔ آپ بھی علامہ اسرار حسنی گنوری کے شاگرد ہیں ۔

یہ ذرا پست قد ہیں ۔ نورانی چہرے (داڑھی سے مزین) کے اوپر چوڑی پیشانی ہے ۔ ڈھیلی ڈھالی قمیص اور قمیص کی جیب میں پتہ نہیں نسخوں پر مشتمل کاغذات ہیں یا خود اپنا دیوان رکھ چھوڑا ہے جیب کاغذات کے وزن سے ڈھلی جارہی ہے ۔ آپ نے غزل سنائی :

آہ یہ گردشِ حالات کہاں تھی پہلے
یہ اندھیرا یہ سیہ رات کہاں تھی پہلے

آپ آئے تو ہوئے خاک کے ذرے تاباں
ان ستاروں سے ملاقات کہاں تھی پہلے

یاد نے تیری بنایا ہے اسے مرکزِ حسن
دل تو پہلے بھی تھا یہ بات کہاں تھی پہلے

ہو نہ ہو بات کوئی ہے کوئی مطلب ہے ضرور
مجھ پہ یہ جبرِ تبسم یہ ستم بات کہاں تھی پہلے

ہجر کی رات میں داغوں کے فروزاں ہے چراغ
ورنہ تابندہ مری رات کہاں تھی پہلے

غالباً آپ نے ہم کو ابھی سمجھا ہے
یہ توجہ یہ مدارات کہاں تھی پہلے

غم نے کچھ بات بنائی تو بنی ہے اشرف
ورنہ جذبات کی یہ بات کہاں تھی پہلے

گردش صاحب نے اپنا فی البدیہہ شعر سنایا :

آج کل آپ میں جو بات نظر آتی ہے
آپ ہی کہئے کہ یہ بات کہاں تھی پہلے

اشرف صاحب نے اپنی دوسری غزل سنائی

عمر بھر ترسا کئے ہم مسکرانے کیلئے
زندگی پائی تھی کیا آنسو بہانے کیلئے

برق بن کر گر چکے لاکھوں نشیمن جل چکے
آداب گلشن میں تازہ گل کھلانے کیلئے

جس سے لرزاں کوہ ہیں جس سے فلک لرزیدہ ہیں
ہے ہمارا دل وہ بارِ غم اٹھانے کیلئے

گریۂ شبنم کا کب ہوتا ہے گلشن پر اثر
پھول کھلتے ہیں چمن میں مسکرانے کیلئے

شمع سے یہ عقدۂ رازِ محبت کھل گیا
حسن بھی مجبور ہے آنسو بہانے کیلئے

دل پہ کیا گذری کسی بیداد گر کو کیا خبر
وہ یہ سمجھا روئے ہیں ہم مسکرانے کیلئے

وہ شبِ وعدہ ضرور آئیں گے از راہِ کرم
یہ خیال اچھا ہے اشرف غم بھلانے کیلئے

مجھے گریۂ شبنم والا شعر بہت پسند آیا میں نے خوب داد دی
رات کے بارہ بج چکے تھے یکایک محفل میں لوگوں کا کچھ اضافہ ہو گیا۔ مشاعرہ ہال کے قریب شاید کوئی سنیما گھر تھا اور سکنڈ شو کے بعد چند ادب نواز حضرات جنہیں نیند نہیں آ رہی تھی مشاعرے میں آ کر شریک ہو گئے۔ اور شاید عورتوں میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔

پھر علامہ گردش نے کہا:

اب اُس شاعر کو سنئے جو کہتا ہے:

جو دامن تیرے چہرے کا پسینہ خشک کرتے تھے
وہ دامن اشکِ خونیں سے گلستاں ہوتے جاتے ہیں

یہ وہ شاعر ہے جس کے بارے میں اشرفؔ صاحب کہتے ہیں:

کہاں تک روشنی پھیلی ہے اندازہ ہی مشکل ہے
ضیائے شمع بزمِ دوستاں ہیں حضرتِ ذوقیؔ

اور جن کے بارے میں جاذبؔ کہتا ہے:

وہ انساں جو ہے دوست انسانیت کا
میرے دوستو! یہ وہی ڈاکٹر ہیں

میرا مطلب ڈاکٹر عبداللہ ذوقی سے ہے جو وانمباڑی کے مشہور ڈاکٹر ہیں۔ سارا گاؤں انھیں جانتا ہے۔ آپ سارے گاؤں کو شاید ہی جانتے ہوں۔ موسیقی کے دل دادہ، (طبلہ کے ماہر) بزمِ وانمباڑی کے سرپرست مولانا ابرؔ احسنی گنوری کے شاگرد ہیں۔ مسکراہٹ اور بذلہ سنجی آپ کی طبیعت بن چکی ہے۔ بہرحال ڈاکٹر صاحب تشریف لائیں۔

ڈاکٹر صاحب صدر سے اجازت لے کر اسٹیج پر بیٹھ کر ہی اپنی غزل سنانے لگے:۔

ان کا رنگ گورا آنکھوں پر عینک، چہرہ صاف اور شفاف چوڑی صورت، بڑا سر تقریباً گنجا ہے آپ نے غزل سنائی:

ترنم عجیب طرز کا تھا۔ اشعار کہنے کا انداز کچھ اس طرح تھا کہ گویا ہر شعر کے اختتام پر ساز چھڑنے والا ہے۔ غالبؔ صاحب حیران کن نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے تھے۔ غالباً انھیں شبہ ہو گیا تھا کہ وہ مشاعرہ کی محفل سے اٹھ کر کسی کلاسیکل پروگرام میں پہنچ گئے ہیں۔

ذوقی صاحب نے غزل سنائی :

عشق نے سینے میں کیا وحشت کا ساماں رکھ دیا
اک دلِ پُرسوز پایا بیاباں میں رکھ دیا

بے خودی موج جب دستِ جنوں کو آ گئی
ٹکڑے ٹکڑے کر کے داماں و گریباں رکھ دیا

ہے دلِ پُرداغ فرشِ راہ وہ آتے ہیں آج
شوق میں زیرِ قدم ہم نے گلستاں رکھ دیا

دستِ قدرت نے عطا کیں یہ بشر کو نعمتیں
دل کو سوزِ غم دیا آنکھوں میں طوفاں رکھ دیا

دردِ فرقت کی کسک ہے یا کسی کی یاد ہے
یا مرے دل میں کوئی خارِ مغیلاں رکھ دیا

زندگی کے ساز میں جو تارِ روح ساز تھا
نام شاید اس کا دنیا نے رگِ جاں رکھ دیا

کس قدر تھی مہربانی اس پہ میرے دوست کی
دل کو تنہا پا کے ذوقیؔ داغِ ہجراں رکھ دیا

گردش صاحب نے یہ شعر دہرایا :

زندگی کے ساز میں جو تارِ روح ساز تھا
نام شاید اس کا دنیا نے رگِ جاں رکھ دیا

پھر آپ نے دوسری غزل سنائی :

غم و اندوہ میرے دل کے ارماں ہوتے جاتے ہیں
تو کیا تکمیلِ الفت کے یہ ساماں ہوتے جاتے ہیں

یہی ناسور بن کر اک دِن دِل سے عیاں ہونگے
جو دل میں جذبِ اشکِ چشمِ گریاں ہوتے جاتے ہیں

جو دامن تیرے چہرے کا پسینہ خشک کرتے تھے
وہ دامن اشکِ خونیں سے گلستاں ہوتے جاتے ہیں

یوں ہی تم مسکرا کر التجا میری سنے جاؤ
گِلے فرقت کے زیبِ طاقِ نسیاں ہوتے جاتے ہیں

عمل پیرا ہو اے غافل یہ خاموشی نہیں اچھی!
زمانے میں ترے مٹنے کے ساماں ہوتے جاتے ہیں

سلجھتے جا رہے ہیں بال جتنے زلفِ برہم کے
مرے ارمان اتنے ہی پریشان ہوتے جاتے ہیں

دمِ آخر ہے جلوے دوست کے نزدیک ہیں ذوقی
غمِ ہستی سے چھٹ جانے کے ساماں ہوتے جاتے ہیں

اس غزل کے بعد چائے کا دور شروع ہو گیا۔ صدر صاحب اور اناؤنسر صاحب کے کوپ تشتری میں چائے آئی مگر دوسرے لوگوں کو چائے کا عرق سپلائی کیا گیا۔ اور لوگ یہ عرق اس طرح پی رہے تھے، جیسے یہ اسی کے عادی ہوں۔ تھوڑی دیر تک محفل میں گلاسوں کی چھن چھن ہوتی رہی۔ پھر اناؤنسر صاحب نے کہنا شروع کیا۔

غم کی تاریک رات ہے اے دوست — دکھ بھری کائنات ہے اے دوست
ایک غم ہو تو میں کبھی سہہ لوں — سیکڑوں غم کی بات ہے اے دوست

یہ وہ شاعر کہتا ہے جسے آپ زاہد اعظمی کے نام سے پکارتے ہیں۔ آپ کا طرزِ فکر کا ایک خاص انداز ہے۔ آپ کا ہر شعر اپنی جگہ ایک نگینہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اشعار سلجھے ہوئے اور خیالات بلند ہیں۔ زاہد اعظمی صاحب تشریف لائیں۔

ایک دبلے پتلے سے آدمی۔ عمر بیس کے قریب۔ چہرے پر مبہم سی داڑھی۔ آنکھوں پر چشمہ۔ چہرے پر بھرپور سنجیدگی۔ اسٹیج پر آئے اور غزل سنانے لگے۔

بے بسی دل کی نمایاں کبھی ایسی تو نہ تھی !
زندگی بے سر و ساماں کبھی ایسی تو نہ تھی

کوئی دھڑکن ہے نہ ارماں ہے نہ حسرت نہ امنگ
دل کی بستی مری ویراں کبھی ایسی تو نہ تھی

ہر طرف پھول مہکتے ہیں مرے زخموں کے
رونقِ جشنِ بہاراں کبھی ایسی تو نہ تھی

ان کی یادیں کبھی تو گنگنا کے نکل جاتی ہیں
بے رخی ان کی نمایاں کبھی ایسی تو نہ تھی

زہرِ غم کو بھی ترسنا پڑا آخر اے دوست
تلخیٔ گردشِ دوراں کبھی ایسی تو نہ تھی

کیوں تری یاد بھی اب وجہ سکوں بن نہ سکی
شدّتِ غم اے مری جاں کبھی ایسی تو نہ تھی

سن کے بیمارِ محبّت کی یہ حالت زاہد
وہ بھی کہنے لگے ہاں ہاں کبھی ایسی تو نہ تھی

ہر شعر پر خوب داد دی گئی۔ گردش صاحب اپنا فی البدیہہ شعر سنایا:

۵

دل کا ہر زخم چمکتا ہے ستارا بن کر
آپ کی یاد درخشاں کبھی ایسی تو نہ تھی

زاہد صاحب نے دوسری غزل سنائی:

کاش مجھ کو بھی راس آتیں خوشیاں کبھی خواہ اک لمحۂ مختصر کیلئے
میں سمجھتا کہ خوشیوں کی یہ ساعتیں مل گئی ہیں مجھے عمر بھر کے لئے

کتنی تاریک ہے زلیت کی رہگذر زندگی کتنی بے رنگ ہے تو بہے
جی رہا ہوں بس امید آسرے یہی اک دیا میرے گھر کے لئے

کیوں نہ صیاد کو دوں میں دل سے دعا گو قفس ہی سہی آسرا تو ملا
میرے صیاد تیرا یہ لطف و کرم کم نہیں ایک بے بال و پر کیلئے

مسکرایا چمن میں جو غنچہ کوئی جانے کیوں مجھ کو اپنا خیال آگیا
دو گھڑی مسکرانے کی پاداش میں مل گیا غم مجھے عمر بھر کیلئے

دردِ دل ہائے اک دردِ سر بن گیا پھر بھی زاہد کسی کی امانت تو ہے
جی رہا ہوں اسی دردِ دل کے لئے جی رہا ہوں اسی دردِ سر کے لئے

پھر گردش صاحب کہہ رہے تھے:

ہاں بنا دو کوئی بت خانہ حرم کے آگے
بندگی کا مری نشا ابھی پورا نہ ہوا

یہ اس شاعر کا خیال ہے جسے لوگ کمال راہی کہتے ہیں۔ بچوں کی تعلیم کا ذمہ اُن کے سر ہے۔ آپ کے قلم سے نکلا ہوا ہر ایک شعر ایک مقبول حیثیت رکھتا ہے۔ مزاحیہ اشعار کبھی کبھی منہ کا مزہ بدلنے کے لیے کہہ لیتے ہیں۔

ایک صاحب چھریرے سے کھلے رنگ والے مائک پہ تشریف لائے۔ جوان العمر تھے۔ شاعر سے زیادہ گلوکار لگ رہے تھے آپ نے تحت اللفظ میں غزل سنائی۔

حال دِل اپنا کوئی پوچھنے والا نہ ہوا
کس کو اپنا کہیں کوئی بھی ہمارا نہ ہوا

آ گیا رشک ہمیں خود پہ کہا جب اس نے
میری نظروں میں کوئی آپ سے پیارا نہ ہوا

آپ کی زلفِ گرہ گیر کے سائے کے سوا
میری دنیا میں کہیں اور بسیرا نہ ہوا

ہاں بنا دو کوئی بت خانہ حرم کے آگے
بندگی کا مری نشا ابھی پورا نہ ہوا

ساقیا مست نگاہوں سے پلا دے مجھ کو
کیا ہوا ہاتھوں گر ساغر و مینا نہ ہوا

غم کو اس واسطے دی دل میں جگہ اے صنم
اس سے بہتر کوئی غمخوار ہمارا نہ ہوا

ایک ہے اس کے لئے جینا مرنا رہی
ہوش میں رہ کے جیسے پاسِ حیا نہ ہوا

گردش صاحب نے اشرف صاحب کا وہ شعر سنایا جو انہیں بہت پسند تھا۔ ؎

چشمِ خونبار نے لعلوں کے سجائے تھے چمن
یہ تماشا تو ہوا دیکھنے والا نہ ہوا

پھر آپ نے دوسری غزل سنائی : ؎

مجھ پہ وہ مست نگاہیں جو اٹھا دیتے ہیں
ایسا لگتا ہے کئی جام لنڈھا دیتے ہیں

جانے کیا بات ہے جرأت یہ انہیں کیسے ہوئی
تیری محفل سے ہمیں غیر اٹھا دیتے ہیں

ایسے انساں بھی ہیں انسانوں کی اس بستی میں
مال و زر کے لئے جو خون بہا دیتے ہیں

یہ مسیحا بھی عجب لوگ ہوا کرتے ہیں
کارگر جب نہ دوا ہو تو دعا دیتے ہیں

کیا بتائیں کہ حقیقت کی حقیقت کیا ہے
"لوگ ہر بات کو افسانہ بنا دیتے ہیں"

راہبر کس لئے خائف ہیں ہمیں سے راہی
راہزن جب ہمیں منزل کا پتہ دیتے ہیں

گردش صاحب نے جاذب کا ایک شعر سنایا : ؎

اودھ بتی میں بھی خوشبو ہے تیری زلفوں کی
ہم یہی لے کے شب ہجر جلا دیتے ہیں

پھر کہنا شروع کیا :

اب اس شاعر کو میں زحمت دے رہا ہوں جو کہتا ہے : ؎

کن منزلوں پہ چھوڑ گئی بے خودی مجھے
خود میں بھی لگ رہا ہوں یہاں اجنبی مجھے

یہ جناب فرحت صاحب ہیں جو سیدھے سادھے الفاظ میں ایسے خوب صورت شعر کہتے ہیں کہ ہر شعر پہ سننے والے تڑپ اٹھتے ہیں ۔ فرحت صاحب تشریف لائیں ۔

ایک گہرے سانولے رنگ کے معمولی وضع کے آدمی مائک پہ آگئے ۔ صورت سے اندازہ کرنا مشکل تھا کہ اتنے اچھے شعر اتنے اچھے انداز میں گا کر سنائیں گے ۔ ؎

کہہ دے اپنے میں جو بات نظر آتی ہے
وہ مری صورت حالات نظر آتی ہے

اے خدا میرے گناہوں سے زیادہ مجھ کو
رحمتوں کی تری بہتات نظر آتی ہے

آپ کے آئینۂ شرم و حیا میں ہم کو — آپ کی شدتِ جذبات نظر آتی ہے

علم و دانش کے اجالے بھی جو چمکا نہ سکے — زندگانی وہ سیہ رات نظر آتی ہے

ان کی بیگانہ نظر کے پسِ منظر فرحت

ہم کو نازک سی کوئی بات نظر آتی ہے

ہر شعر کامیاب رہا۔ حضرتِ گردش کو اس بار نیا شعر بنانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ انھوں نے اشرف صاحب کی غزل پر جو شعر سنایا تھا اسی کو الٹا کر کے سنا دیا۔ ؎

آپ ہی کہئے وہ بات کہاں تھی پہلے

آجکل آپ میں ہر بات نظر آتی ہے

پھر فرحت صاحب نے دوسری غزل سنائی: ؎

یوں کھو گئے ہیں کیفیتِ بے خودی میں ہم

پہچانتے ہیں خود کو تیری روشنی میں ہم!

اک تیرا غم ہمارے لئے خضرِ راہ تھا

گم ہو چکے تھے ورنہ غمِ زندگی میں ہم

کیا کیا نہ جانے کھل گئے اسرارِ کائنات

کیا کیا نہ جانے کہہ گئے دیوانگی میں ہم

ہر غم سے ہر ملال سے بیگانہ ہو گئے!

اپنی خوشی کو چھوڑ کے تیری خوشی میں ہم

علم و ہنر کی شمع فروزاں سہی مگر

محروم روشنی سے رہے روشنی میں ہم

ہو آپ کو سمجھنے کی جرأت تو سمجھئے

کہتے ہیں کیا اے اہلِ جفا خامشی میں ہم

ہم نے اسے اجل کے بہانے سنا دیا

فرحت جو راز کہہ نہ سکے زندگی میں ہم

گروش صاحب نے آپ کا یہ شعر دہرایا:

کیا کیا نہ جانے کھل گئے اسرارِ کائنات

کیا کیا نہ جانے کہہ گئے دیوانگی میں ہم

اب اس نوجوان شاعر کو سنئے جو کہتا ہے:

کس لئے محوِ غم ہو گئی چاندنی

کیوں سراپا الم ہو گئی چاندنی

کون رویا تھا پچھلے پہر رات کو

کس کے اشکوں سے نم ہو گئی چاندنی

یہ سہیل عارف ہیں B. Tech کے طالب علم ہیں۔ کم عمری ہی سے شاعری کر رہے ہیں۔ غزلوں کے ساتھ ساتھ جدید طرز کی نظموں میں بھی کمال کر دیتے ہیں۔

ایک دبلا پتلا نوجوان تنگ پتلون اور سلاک، بال پریشان کھلا رنگ، لمبا چہرہ، پچکے گال اسٹیج پر آگیا اور غزل سنانے لگا

موت اپنی نہ زندگی اپنی — صرف فانی ہے لے بھی اپنی

تذکرہ ہے چمن چمن تیرا — اور کہانی گلی گلی اپنی

اف یہ بیدرد وقت کے پنجے | ہائے معصوم زندگی اپنی!
درد کے مٹمگیے دھندلکوں میں | کھوگئی ہے ہر اک خوشی اپنی
جگ میں بننے لگے ہیں افسانے | رنگ لائی ہے خاموشی اپنی
وحشیوں بھیڑیوں کی جھرمٹ میں | پوچھیئے کیا ہو کیا بنی اپنی

سب لوگ داد دے رہے تھے مگر مجھے آخری شعر کسی چیرواہے کی داستان لگ رہا تھا۔ گردش صاحب نے اپنا شعر سنایا جو کچھ مزاحیہ رنگ کا تھا۔ ؎

جب بھی ان سے نظر ملی اپنی
اُڑ گئی سر سے کھوپڑی اپنی

سہیل صاحب نے پھر ایک نظم سنائی: ؎

چاندنی جھانکتی ہے
ان دریچوں کو کھلا رہنے دو
ان اندھیروں میں
کوئی دیپک تو جلے
کچھ اجالا تو رہے
ورنہ تاریکی میں دم گھٹ جائے گا
تم یہ کہتے ہو کہ خاموش رہا کرتا ہوں
کس کی یادوں میں گھرا رہتا ہوں
انہیں یادوں میں گھرا رہنے دو

یہی یادیں تو ہیں میرا جیون
میں وہ دیپک ہوں کہ جس میں اے دوست
بھولی بسری ہوئی یادوں کا لہو جلتا ہے
انھیں یادوں میں گھرا رہنے دو
چاند کو جھانکنے دو
ان اندھیروں میں کوئی دیپک تو جلے
ورنہ تاریکی میں دم گھٹ جائے گا۔

مشاعرے والوں کی خوش قسمتی کہئے کیوں کہ ذرا دیر کے لئے غالباً غالب صاحب کی آنکھ لگ گئی تھی اور انھوں نے اس نظم پر دھیان نہیں دیا۔ ورنہ معلوم نہیں کیا حشر برپا ہوتا۔

۵ پھر گردش نے کہا:

کاغذ کی کشتیوں پہ بھلا اعتماد کیا
بے کار آندھیوں کو نہ بدنام کیجیے

یہ حضرتِ جلالؔ کرڑوی ہیں۔ آپ اسلامیہ کالج وانمباڑی کے اردو پروفیسر ہیں۔ آپ کے نعتیہ کلام کا مجموعہ "آمنہ کا لال" شائع ہو چکا ہے۔ آپ کی غزلیں بھی مقبول ثابت ہوتی ہیں۔ آپ کی آواز میں جادو بھرا ہوا ہے۔ حضرتِ جلالؔ تشریف لائیں۔

میں نے دیکھا آپ کالی شیروانی، پاجامہ، سر پر سفید کپڑے کی ٹوپی میں ملبوس ہیں۔ سانولا رنگ عمر پچاس کے قریب اور

چہرے پر داڑھی۔ آواز بڑی دلکش اور ترنم سحر انگیز
آپ نے غزل سنائی :

تیرے خیمۂ ازل کو میں جلا کے رکھ ہی دوں گا
حذر اے فلک کہ تو نے مری آہ کو نہ جانا

یہ نصیب اپنا اپنا کوئی خوش ہے کوئی غمگیں
یہ تو قاسم ازل کا ہے نظامِ آب و دانہ

دمِ طوف کہہ رہا تھا یہی شمع سے پتنگا!
ترا حسن بھی فسانہ مرا عشق بھی فسانہ

مرے ہم وطن چلے ہیں مجھے آج ہند یا نے
کسے اب کہوں پرایا کسے اب کہوں یگانہ

کسی برق کا الٰہی نہ ادھر ہو دور دورہ
رکھی ہم نے اب قفس میں نئی طرح آشیانہ

اے مسافر اپنی منزل ہے کہاں کسے خبر ہے
کہیں نظم آب و دانہ کہیں ختم آب و دانہ

ہے جبیں یہ نقش اس کا ہے جبیں کا نقش اس پر
وہ ہے سنگِ آستانہ یہ ہے ننگِ آستانہ

غزل کا مطلع مجھے یاد نہیں ۔ ہر شعر پہ خوب داد
ملی۔ اور پھر آپ نے ایک نعتیہ کلام سنایا۔

وہ دل ہی کیا جو ترے عشق میں پگھل نہ سکا

وہ دم ہی کیا جو تری راہ میں نکل نہ سکا
وہ اشک کیا ہے تری راہ میں جو ڈھل نہ سکا
وہ خون کیا جو ترے سوز میں اُبل نہ سکا
ہٹا جو راہ سے تیری محمدِ عربی! ا
قسم خدا کی وہ راہی کبھی سنبھل نہ سکا
اے شمع بزم ازل تیرے آگے کوئی چراغ
جلا تو بجھ نہ سکا اور بجھا تو جل نہ سکا
جو طفلِ دل ترے دامن کی جنبشوں میں پلا!
جہاں کے فانی کھلونوں سے وہ بہل نہ سکا
مکینِ گنبدِ خضرا کا لطف ہے ہم پر
کہ آسماں کبھی چھاتی یہ مونگ دل نہ سکا
ہزاروں ابھرے سیاست کے سامری لیکن
کسی کا سحر بھی قرآں کے آگے چل نہ سکا
بدلتی دنیا بدلتی رہی ہمیشہ جلالؔ
مگر نظامِ محمدؐ کبھی بدل نہ سکا

پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ یعنی لائٹ آف ہوگئی تھی۔ اور لوگ اپنی اپنی ماچس جلانا شروع کر دیئے اور آنِ واحد میں سو سے زائد دیا سلائیاں ضائع ہوگئیں۔ کیونکہ دوسرے ہی لمحے پھر روشنی آگئی تھی۔ اناؤنسر صاحب نے کہنا شروع

کیا - اب میں اس شاعر کو پیش کر رہا ہوں - جو کہتا ہے : ؎

لے کر رہوں گا حشر میں رضوان دیکھنا
آدمؑ کے ہاتھ سے وہ جو جنّت نکل گئی

یہ جناب قابلؔ صاحب ہیں - بشیر احمد قابلؔ کلام خود کے حافظ ہیں - بیاضِ دل سے پڑھتے ہیں - قابلؔ صاحب تشریف لائیں -

قابل صاحب اسٹیج پر آئے - کالا رنگ اور سفید لباس سر پہ کالی ٹوپی ہے - عمر چالیس کے آر پار ہے - داڑھی مونچھ سے بے نیاز چہرے پر کہیں کہیں جھُریاں -

غم و فراق نے ہوش و خرد پہ وار کیا
جنوں نے جیب و گریباں کو تار تار کیا

اٹھا اٹھا کے گناہوں کو آشکار کیا
لپٹ لپٹ کے مجھے رحمتوں نے پیار کیا

بروزِ حشر بتا نا مری خطا کیا تھی
جہاں میں بھیج کے مجھ کو ذلیل و خوار کیا

لگا کے آگ نشیمن کو اپنے ہاتھوں سے
گھٹا کی گود میں بجلی کو بے قرار کیا

جو خشک ہو گئے آنسو تو دل کے زخموں نے
لہو نچوڑ کے آنکھوں کو اشکبار کیا

علامہ گردش نے آپ کے اس شعر کو دہرایا۔

لگا کے آگ نشیمن کو اپنے ہاتھوں سے
گھٹا کی گود میں بجلی کو بے قرار کیا

پھر قابل صاحب نے دوسری غزل سنائی :

آمادۂ وفا جو ہوئے جاں نکل گئی — وہ کیا بدل گئے مری دنیا بدل گئی
اک تیغ آہ ابر کے سینے پہ چل گئی — اک برق تلملا کے گری اور جل گئی
یہ کس کی جان سوزش شعلوں میں ڈھل گئی — شب بھر سسک سسکتی ہوئی شمع جل گئی
یہ کس کا آشیاں ہے یہ معصوم کون ہے — جو گرتے گرتے برقِ تپاں بھی سنبھل گئی
ہونٹوں پہ کانپتی ہوئی فریاد کی قسم — جو بھی بہار آئی جوانی میں جل گئی
لے کر رہوں گا حشر میں رضوان دیکھنا — آدمؑ کے ہاتھ وہ جو جنت نکل گئی
یہ پھر وہ راہ انجم افلاک زیر پا ! — قابل کی فکر عرش سے آگے نکل گئی

حضرتِ غالب نے پہلو بدلا اور آرام سے بیٹھ گئے۔ جنت کی آب و ہوا میں خنکی کے عناصر شاید ضرورت سے زیادہ ہوں گے۔ ورنہ غالب کے ہاتھوں میں ناس کی ڈبیہ کیوں نظر آتی۔ آپ نے ناس چٹکیوں میں دبا کر ناک میں رکھی اور طویل سانس کھینچی :

پھر گردش صاحب نے کہا:

ہر گھڑی تیرا تصور تیرا غم ساتھ رہا
تیری الفت کی قسم میں کبھی تنہا نہ ہوا

یہ ہیں نورؔ آفاق صاحب پاکیزہ خیالات اور پاک جذبات پر مبنی آپ کا ہر شعر داد کے قابل ہوتا ہے۔ آواز خدا نے ایسی دی ہے کہ ان کا نام آئے تو محفل میں جان آجاتی ہے۔ مقامی شعرا میں ترنم کے شہنشاہ کہے جا سکتے ہیں۔ آپ کا پورا نام نور اللہ نورؔ ہے۔ اور آپ کی شخصیت بھی نورٌ علیٰ نور۔

میں نے دیکھا کم عمر شاعر ہے۔ بالکل سیدھا سادھا آدمی۔ آواز واقعی اچھی تھی۔

چھپ کر بھی آپ چھپ نہ سکیں گے نقاب میں
یہ چاند کب رہا ہے ہمیشہ سحاب میں
جو رنگ و بو تمہارے حسیں پیرہن میں ہے
وہ رنگ و بو کہاں ہے چمن کے گلاب میں
زندہ حقیقتوں کو جو شرما دیں دوستو!
ایسی حقیقتیں بھی ہیں پوشیدہ خواب میں
ممکن ہے بخشوا دیں ہمارے گناہ سب
وہ لمحہ جو گذر گیا کارِ ثواب میں
ان کو بغور پڑھ کے جو دیکھیں تو ہو خبر

خوشیوں کا ذکر بھی ہے غموں کی کتاب میں

تفریق رنگ و نسل یہیں تک ہے دوستو

برتر نہیں ہے کوئی خدا کی جناب میں

اے نورؔ جن کے پاؤں فرشتے بھی چوم لیں

ایسے بھی آدمی ہیں جہانِ خراب میں

پھر نورؔ صاحب نے اپنی دوسری غزل سنائی: ۵

کونسا فتنہ زمانے میں خدایا نہ ہوا

پھر بھی انسان کو اندیشۂ فردا نہ ہوا

اشکِ غم روک لیں ہمنے بھی یہ چاہا لیکن

اپنے قابو میں یہ بہتا ہوا دریا نہ ہوا

ہر گھڑی تیرا تصور تیرا غم ساتھ رہا

تیری الفت کی قسم میں کبھی تنہا نہ ہوا

تم تھے اپنے تو ہر اک چیز تھی اپنی لیکن

تم ہوئے غیر تو پھر کوئی ہمارا نہ ہوا

جب ہمیں اپنوں کی بیگانہ روی یاد آئی

غیر کو غیر سمجھنا بھی گوارا نہ ہوا

شعر گوئی میں، ظرافت میں زباں دانی میں

آج تک دوسرا غالب کوئی پیدا نہ ہوا

چار سو یوں تو چراغاں کا سماں تھا لیکن خانۂ دل میں کہیں نور اجالا نہ ہوا

غالبؔ والے شعر پر غالبؔ صاحب صرف مسکرا کر رہ گئے :

گردش نے کہنا شروع کیا :

اب اس نشانہ باز کو سنئے جو کہتا ہے : ؎

بہت بیتاب ہیں مدت سے تلواریں میانوں میں
الجھنے کے لئے بے چین ہیں تیریں کمانوں میں
سخن کی تیر اندازی میں ہوں مسحورؔ وہ ماہر
نظر دھوکا نہیں کھاتی کبھی میری نشانوں میں

یہ حضرتِ مسحورؔ ہیں اور یہ کبھی اپنے متعلق یوں کبھی کہتے ہیں : ؎

میزان میں گوہر کے سخن بول رہا ہے
الفاظ کو موتی کی طرح طول رہا ہے
مسحورؔ کی آواز ہے یا نغمۂ بلبل
یا طوطیٔ طوبیٰ ہے سخن بول رہا ہے

مسحورؔ صاحب وانم باڑی کے پرانے شاعروں میں سے ہیں۔ شاعری کے میدان میں آپ ماہر شہ سوار مانے گئے ہیں۔ آپ کا پیشہ مصوری ہے۔ اور ایک زمانہ آپ نے ڈرائینگ ماسٹری میں گذارا ہے۔ زبان اور لغت کی باریکیوں پر پوری عبوریت رکھتے ہیں۔

حضرتِ مسحورؔ تشریف لائیں :

ایک پست قد کے ادھیڑ عمر شخص مائک پر پہنچے۔ چہرہ داڑھی مونچھ سے بے نیاز تقریباً گنجا سر۔ پاینٹ اور سلاک پہنے ہوئے۔

آپ نے اردو زبان کے متعلق ایک قطعہ سنایا :

مجھے دکھاؤ نہ ہمدم یہاں وہاں کے چراغ
ہیں چاند تاروں سے بڑھ کر مرے مکاں کے چراغ
زباں زباں پہ ہے اردو زبان اے مسحور
جلینگے دہر میں گھر گھر مری زباں کے چراغ

آخری مصرع پر غالب صاحب نے واہ واہ کے ساتھ آمین بھی کہا :

پھر انھوں نے غزل سنائی

ادنیٰ بھی حقیقت میں ہے اعلیٰ مرے آگے
قطرہ میں بھی پوشیدہ ہے دریا مرے آگے

گذرا کبھی ظلمات کا عالم مرے پیچھے !
اب پیکرِ تنویر ہے تنہا مرے آگے

مردہ ہوں کہ زندہ خبر اپنی بھی نہیں ہے
یہ گور ہے یا وحشتِ صحرا مرے آگے

ہوتا نہ اندھیرا تو اجالا بھی نہ ہوتا !
کعبہ سے نہ کچھ کم ہے کلیسا مرے آگے

مایوس مجھے دیکھ کے اعمالِ سیہ پر
دیتی ہے تسلی مجھے توبہ مرے آگے

ہے دعویٰ دیدار عبث اہلِ نظر کو
نا بینا سے بڑھ کر نہیں بینا مرے آگے

اور مسحور صاحب نے جب غالب کے مصرع پر گرہ سنائی تو

وہ بہت خوش ہوئے ۔

لوٹا ہو وضو کا کسی زاہد کو مبارک

رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

گردش صاحب نے کعبہ و کلیسا والا شعر دہرایا۔

پھر مسحور صاحب نے دوسری غزل سنائی ۔۔

چٹکتی چاندنی ہے رات بھی کتنی سہانی ہے

گلوں کی رنگ بیاں ہی صبا کی چھیڑ خوانی ہے

چمن روتا ہے کس کو یاد کر کے کون کیا جانے

کلیجہ قطرۂ شبنم کا جس سے پانی پانی ہے

وہ منظور نظر ہو کر بھی مجھ سے دور رہتے ہیں

کبھی کچھ بدگمانی ہے کبھی کچھ پاسبانی ہے

دلِ نخچیر سے قطرے لہو کے رنگ لائے ہیں

نظر کا تیر ہے یا تیغ ابرو کی کمانی ہے

اندھیرا جس کو کہتے ہیں نہیں ہے مری راتوں میں

مری یادوں کی محفل میں قمر کی ضوفشانی ہے

اور آخر کے دو شعر میں ٹھیک سن نہیں سکا تھا۔ مشاعرہ

ہال کے قریب شاید ریلوے لائن ہے۔ کوئی گاڑی جھن جھناتی ہوئی گذر

رہی تھی۔

گردش صاحب نے کہا

اب میں اس شاعر کو تکلیف دے رہا ہوں جو اپنے آنسوؤں میں اتنی روشنی محسوس کرتا ہے کہ ساری دنیا کو اجالا دے سکے اور کہتا ہے

جہاں جہاں بھی غم دل کی تیرگی ہوگی!
وہاں وہاں مرے اشکوں کی روشنی ہوگی

میرا مطلب جناب غوث صاحب غوث سے ہے۔ آپ کو سائنس پڑھانے میں بڑی مہارت ہے۔ بی ایس سی، بی ٹی، ہیں۔ اخلاقِ انسانی کا مکمل پیکر اور اصولوں کا پابند یہ شاعر اپنے ہر شعر میں قوم و ملت کی اصلاح چاہتا ہے
جب علامہ گردش نے آپ کا نام لیا تو میں نے سوچا کوئی بھاری بھرکم شخصیت ہوگی۔ اور گرجدار آواز کے ساتھ سامعین پر حملہ آور ہوں گے لیکن میں نے دیکھا ایک دبلے پتلے شاعر ہیں اور درمیانی آواز میں غزل سنا رہے ہیں:

نہ دوا مانگی تھی میں نے نہ دعا مانگی تھی
درد و غم کے لئے بس خود سے رضا مانگی تھی

سب کو جب گوہرِ مقصود ملے روز ازل
چشمِ تر کے لئے کہا میں نے دعا مانگی تھی

عرش اعظم کا ترے میں نے پتہ کب مانگا
اک تصور کو ترے فکرِ رسا مانگی تھی

اتنے سجدے جو کئے کیا اسی جنت کیلئے
اے خدا میں نے فقط اس کے سوا مانگی تھی

ظلم کے شعلے برستے ہیں یہ کیوں چرخ کہن
میں نے دنیا میں جو پر امن فضا مانگی تھی
کیوں مداوا نہ ہوا درد کا تیرے اے غوث
درد کچھ اور تھا کچھ اور دوا مانگی تھی!

گردش صاحب نے آپ کا یہ شعر دہرایا:

عرش اعظم کا میں نے پتہ کب مانگا
اک تصور کو ترے فکر رسا مانگی تھی

اس کے بعد آپ نے اپنی دوسری غزل سنائی:

عمر کیسی کٹی تھی یاد نہیں — یہ بری تھی بھلی تھی یاد نہیں
سب پہ چھایا تھا ظلم دہر مگر — کس پہ بجلی گری تھی یاد نہیں
گھونٹ میں پی گیا تھا گو تردید — کتنی تشنہ لبی تھی یاد نہیں
خونچکاں ہو گیا تھا دل مرا — آنکھ کس سے لڑی تھی یاد نہیں
آہ جا جا کے لوٹ آتی تھی — آہ میں کیا کمی تھی یاد نہیں
موت ہنستی رہی تھی عمر تمام — زندگی کب ہنسی تھی یاد نہیں
مری مژگاں پہ اشک رقصاں تھے — غم دل یا خوشی تھی یاد نہیں

ان کے در پر جو گذری عمر غوث
زندگی، بندگی تھی یاد نہیں!

یہ وہ ساری چیزیں تھیں جو حضرت غوث کو یاد نہیں رہی تھیں۔ اس کے بعد گردش صاحب نے کہا:

مست آنکھوں کی بات کرتے ہیں
حسن والوں کی بات کرتے ہیں
آپ انور سیاہ راتوں میں
چاند تاروں کی بات کرتے ہیں

یہ جناب انور کمال صاحب ہیں۔ اسلامیہ ہائی اسکول کے مدرس ہیں۔ آپ آرٹسٹ بھی ہیں اور یہی رنگ شاعری میں بھی نظر آتا ہے شعر کے ہر ہر لفظ کو الگ الگ رنگ دے کر سنوارتے ہیں۔

انور کمال مائک پر پہنچے۔ آپ جوان العمر ہیں۔ گہرا سانولا رنگ ہے۔ چہرے سے تو شاعر نہیں لگتے تھے۔ کھڑے ہونے کا انداز ایسا تھا جیسے ایک پیر میں موچ آگئی ہو:-

انھوں نے غزل سنائی:-

جلتا ہوا یہ دل ہے مگر آنکھ نم نہیں
غم اس قدر ملے ہیں کہ اب غم کا غم نہیں

دل میں تو تیری یاد کے روشن ہیں سو چراغ
مانا کہ ہم پہ تیری نگاہِ کرم نہیں

عمر تمام جن کی خزاں ہی میں کٹ گئی!
اس کے لئے خزاں بھی بہاروں سے کم نہیں

اے شیخ ہم سے ہوش و خرد کی نہ بات کر
تیرے لئے شراب ابھی محترم نہیں!

انور گلہ کرو نہ زمانے سے اب کوئی
غم جو ملا نصیب میں کیا یہ کرم نہیں!

پھر آپ نے دوسری غزل سنائی: ؎

رونقِ محفل بڑھے گی آپ کے آنے کے بعد
ورنہ کیا رکھا ہے ساقی جام چھلکانے کے بعد

میری مدہوشی میں ساقی تو ہی میرا ساتھ دے
میں نہ دیکھوں زندگی کو ہوش میں آنے کے بعد

زندگی میں زندگی کا جب مزا باقی نہیں
کیا کریں گے زندگی ہم دل کے لٹ جانے کے بعد

تو نہ انور تشنگی میں حسرتوں کا نام لے
تشنگی مٹ جائیگی حسرت نکل جانے کے بعد

غزل کے فوراً بعد گردش صاحب نے اپنا فی البدیہہ شعر سنایا ؎

روشنی تھی چاند تاروں کی فقط میرے لئے
چاند تارے سو گئے تھے میرے سو جانے کے بعد

پھر انھوں نے کہا:

لیجئے محفل کا رنگ بدلنے کے لئے اب میں اس مزاحیہ شاعر کو دعوت دے رہا ہوں جو کہتا ہے: ؎

سارا دیواں اگل کے رکھ دوں گا
روز دعوت دیا کرے کوئی

یہ ہیں دھڑاک صاحب ہیں۔ ابھی طالب علمی کے دور سے گذر رہے ہیں۔ شعر لکھنے اور کہنے کا انداز بتا رہا ہے کہ بہت جلد یہ دنیا کے سارے مزاحیہ شاعروں کو پیچھے چھوڑ جائیں گے۔ طنز و مزاح میں کمال رکھتے ہیں حیدرآباد

یں چند سال رہ چکے ہیں۔ وہاں کا رنگ اور انداز ان کے کلام میں حاوی نظر آتا ہے۔
بے دھڑک صاحب تشریف لائیں۔

یہ ایک ہٹا کٹا نوجوان شاعر ہے جسم پر سلاک اور پاجامہ رنگ سانولا۔ بال بکھرے ہوئے۔ کلام عجیب و غریب۔ ترنم سے سنانے لگا۔

بے دھڑک نے غزل سنائی:

مفت اپنی دوا کرے کوئی ۔۔۔ ۔۔۔ایسی ہوا کرے کوئی
پھٹو جوتی سیا کرے کوئی ۔۔۔ ایسی بیگم ہوا کرے کوئی
یہ حماقت کیا کرے کوئی ۔۔۔ بخش دیں اور خطا کرے کوئی
شاعری کیوں کیا کرے کوئی ۔۔۔ جب نہیں گھر میں دال آٹا تک
جیب بھاری کیا کرے کوئی ۔۔۔ دیکھنا ہو کمال "مجنوں" کا
روز دعوت کیا کرے کوئی ۔۔۔ سارا دیوان اگلے رکھ دونگا
میرے دق کی دوا کرے کوئی ۔۔۔ پھیپھڑے سڑ گئے ہیں یاؤں سے
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی ۔۔۔ بک رہا ہوں ہمل میں کیا کیا کچھ

پھر بے دھڑک صاحب ایک فلمی گیت کی پیروڈی گا کر سنانے لگے۔ جو شاید فلم "دو راستے" کا تھا۔ (بندھیا چمکے گی)

وہ بتی جھٹکے گی ۔۔۔ تو چوڑی کھنکے گی

گورے ہاتھوں میں کنگن کیا بولوں ......!!

وہ روٹی بیلے گی ۔۔۔ تو دل ہی لے لیگی

گورے ہاتھوں میں بیلن کیا بولوں!

وہ مہمان یوں کہہ کل آئی مرے گھر
کنبے کا کنبہ ساتھ لے کر وہ مہمان
بیماری اور بے کاری کے شہزادے کا دل سوچا.... ارے یہ دل سوچا
گھر میں لکڑی نہ راشن کیا بولوں.... وہ نلّی....
وہ اماں بولی ذرا دھو دے چولی
میں سینما کو جاؤں گی وہ اماں بولی۔
فٹ فٹ چولی فٹ فٹ ساری
اس پر چہرہ میک اپ کا
تیری اماں کا فیشن کیا بولوں
وہ نلّی جھٹکے گی......

لوگ ہنستے ہنستے بے حال ہو گئے تھے۔ اور کچھ سنانے کی فرمائش ہوتی رہی۔ بیدھڑک صاحب نے بے دھڑک کچھ پیروڈیاں سنائیں اور چلے گئے۔

ہر طرح کے جذبات کا اعلان ہے جوتا
آندھی کبھی جھکڑ کبھی طوفان ہے جوتا
جوتے ہی دکھاتے ہیں ہر اک چوٹ پہ تارے
عشاق کے اعجاز کا سامان ہے جوتا!

جوتے نہ پڑے تیرے کسی غیر کے سر پہ
الفت میں اہم چیز مری جان ہے جوتا

جو توں ہی سے ہوتی ہے شروعاتِ محبت
انجان ہیں دو دل اگر انجان ہے جوتا
اس حسن کی چوکھٹ کو کوئی چھو نہیں سکتا
جس حسن کی چوکھٹ کا نگہبان ہے جوتا

پھر اناؤنسر نے کہا
اب اس شاعر کو سنئے جو کہتا ہے:

جب رات اندھیروں کا کفن لاتی ہے
امید کے لاشوں کو لئے روتا ہوں
اور دیکھنے والے یہ سمجھتے ہوں گے
آرام سے بستر پہ پڑا سوتا ہوں

یہ ہیں ندیم صدیقی۔ بے چارے کی ہر رات جگ کر گزر رہی ہے۔ گریجویٹ ہیں اور ایم۔ اے کے طالب علم ہیں۔ آواز بڑی پیاری پائی ہے۔ اگر آپ انھیں دیکھے بغیر آواز سن لیں تو آپ سمجھیں گے کہ لتا منگیشکر اور رفیع اور مناڈے ایک ساتھ مل کر گانا گا رہے ہیں۔ طبیعتاً آزاد فضا کے قائل ہیں۔ خیالات میں نیا پن اور انوکھا پن پایا جاتا ہے۔ ندیم صاحب تشریف لائیں۔

ایک لمبا، گورا جوان عمر شاعر آیا۔ ٹائٹ پائنٹ والا چوڑی دار سیلاک سر گھٹا ہوا چہرے پہ باریک داڑھی صورت پہ دنیا بھر کی بےزاری۔ مائک کے ایک قدم ادھر ہی کھڑے ہو کر غزل سنانے لگے۔

گردش صاحب نے مائک سامنے کر دیا، آواز بڑی پیاری تھی ؎

آپ کے گھر سنگ پھینکا جائے گا | اور تماشا چھپ کر دیکھا جائیگا
کوئی تو منزل پہ رکھے گا قدم | تم نہ جاؤ گے تو رستہ جائے گا
مشورے ہوتے رہیں گے تا حیات | زندگی کو روز ڈھونڈا جائے گا
جس جگہ رسوا ہوا ہوں آج میں | کل وہیں پہ مجھ کو ڈھونڈا جائے گا
سوچ کی راہوں میں پتھر آ گئے | ذہن کے پردوں کو چھیلا جائے گا
پیڑ پتوں کی زباں بن جائیں گے | جنگلوں میں گھر بسایا جائے گا

کب تلک بہلاؤ گے دل کو ندیم
کب تلک یہ کھیل کھیلا جائے گا

گردش صاحب نے یہ شعر دہرایا ؎

مشورے ہوتے رہیں گے تا حیات
زندگی کو روز ڈھونڈا جائے گا

پھر انھوں نے ایک فی البدیہہ شعر کہا: ؎

خون بھی ہم انا کے در پہ لیپ دیں
پھر بھی ہم کو غیر سمجھا جائے گا

پھر ندیم صاحب نے ایک نظم سنائی:

تیری معصوم اداؤں کی قسم اتنا بتا
اپنی اک طرفہ محبت کو کہاں لے جاؤں
سوچتا ہوں تجھے کس نام سے اب یاد کروں

یاد ہے اب بھی مجھے عشق کی پہلی منزل
کتنے ارمانوں سے اک روز پکارا تھا تجھے
کتنے لمحوں کی گرانی کا اٹھایا تھا بار
کتنے سپنوں کے سراپوں میں اتارا تھا
کتنی راتوں کا لہو بیچ دیا تیرے لئے
کتنے لفظوں میں، تکلم میں سنوارا تھا تجھے
کتنے گیت لکھے تھے تری زلفوں کے لئے
کتنے نغموں کے الاپوں میں نکھارا تھا تجھے

کیا اسی دن کے لئے بھیک ملی تھی الفت
نبضِ امید اسی دن کے لئے ابھری تھی
کیا اسی دن کے لئے رینگتا رہا برسوں سے
کیا اسی دن کے لئے زلف تری بکھری تھی

چند خوابوں کے وسیلوں کا تصور لے کر
زیست نے میرے لئے درد اٹھا رکھا ہے۔
کچھ تو فطرت نے نوازا ہے جنوں کا انداز
کچھ غمِ عشق نے دیوانہ بنا رکھا ہے

احمریں ہونٹ گلابی گال نکھرتے ہوں گے
گورا رنگ اور سفیدی میں ملاتا ہو گا
اب مری یاد کا یہ تو کبھی نہ آتا ہو گا

اب کوئی اور تجھے راگ سناتا ہوگا
سوچتا ہوں تجھے کس نام سے اب یاد کروں

علامہ گردش نے پھر کہا:

آرزوئیں بھی سو گئیں تھک کر
جیسے تقدیر سو گئی اپنی

یہ اس نوجوان شاعر کے الفاظ ہیں جسے آپ ساجد کہتے ہیں
عبدالغفور ساجد بی ایس سی کے طالبعلم ہیں۔ ان کا قلم بڑی تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ ماشاء اللہ

ساجد اسٹیج پر آئے بہت ہی کم عمر گورے چٹے چھریرے بدن والے یہ کمسن شاعر نے جو غزلیں سنائیں بہت پسند کی گئیں:۔

مدت ہوئی نہیں ہے کچھ اپنی خبر مجھے
اس کا علاج کیا ہے بتا چارہ گر مجھے

بے رنگ و کیف لگتے ہیں شام و سحر مجھے
لے آیا ہے کہاں مرا درد جگر مجھے

رکتے نہیں ہیں اشک جدائی میں کیا کروں
رسوا کہیں کرے نہ مری چشم تر مجھے

ہاتھوں میں میرے دے کے گریباں کی دھجیاں
لے جا رہا ہے جوشِ جنوں اب کدھر مجھے

میری جبیں نے توڑ دیا سنگِ آستاں
حیرت زدہ ہیں دیکھ کے دیوار و در مجھے

گو بد نصیب ہوں مگر آزاد طبع ہوں
ہرگز خرید سکتے نہیں سیم و زر مجھے

ساجدؔ میں اب شکایتِ احباب کیا کروں
جب دے گئی فریب خود اپنی نظر مجھے

گردش صاحب نے گریبان والا شعر دہرایا:

پھر ساجدؔ نے دوسری غزل سنائی:

میں اسیرِ کنجِ قفس ہوں غمِ جہاں سے گذر گیا
غمِ گلستاں سے گذر گیا، غمِ آشیاں سے گذر گیا

لئے دل میں یادوں کی تلخیاں، میں امید و بیم کے درمیاں
تری جستجو میں اے جانِ جاں، میں کہاں کہاں سے گذر گیا

تری چاہ تھی مری زندگی، تجھے میں نے چاہا تھا کسقدر
تری چاہ میں مرے ہم نفس، میں تو اپنی جاں سے گذر گیا

مری زندگی میں ہیں کتنے غم، تمہیں کچھ خبر بھی ہے، ہاں ہاں
تمہیں ہر قدم پہ ملیں گے غم میں جہاں جہاں سے گذر گیا

مجھے زندگی نے وہ غم دیے کہ میں ہر خوشی کو بھلا دیا
ترے پیار کا لئے آسرا، میں ہر امتحاں سے گذر گیا

کہیں مجھ سے کی تو نے بے رخی تو میں کیا کروں گا اے جانِ من
کئی بار سوچ کے میں یہی ترے آستاں سے گذر گیا

اناؤنسر نے کہا:

وقت کی خود ہمیں خبر نہ ہوئی!
ہم نے اوقات یوں گذارے ہیں!

یہ شعر جناب کلیم طاہری صاحب کا ہے۔ آپ مدرس ہیں نرم مزاج اور پُرخلوص طبیعت پائی ہے۔ بہت کم گو اور خاموش پسند ہیں آپکے اشعار میں بھی آپ ہی کی تصویر نظر آتی ہے۔ بہت مدت سے کلام کہتے ہیں

کلیم صاحب تشریف لائیں۔

میں نے دیکھا گہرے سانولے رنگ کے درمیانہ قد کے آدمی سلاک اور پیانٹ سر پر ٹوپی۔ چہرے پر داڑھی اور داڑھی کے درمیان مسلسل مسکراہٹ۔ مائک پر آئے چلنے کا انداز ایسا تھا جیسے پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے ہوں اور غزل سنانے کا انداز ایسا تھا جیسے کسی مسجد میں کوئی حدیث کی کتاب پڑھ کر سنا رہے ہوں۔ آپ نے غزل سنائی: ۵

بغیر درد کے اک بیت میں کمی ہوگی
متاعِ غم کے سہارے ہی زندگی ہوگی

نظر میں یاد کی بستی تری بسی ہوگی
قدم اٹھے گا جدھر بھی تری گلی ہوگی

ترے وصال کا سورج جو کبھی ابھر یگا
ڈھلے گی ہجر کی شب وہ تیرگی ہوگی

خوشی کے پہلو میں جس طرح درد پلتے ہیں
ضرور پردۂ غم میں خوشی چھپی ہوگی

پڑی ہے جان پتنگوں کے قافلوں میں نئی
کسی چراغ کی لو تیز ہوگئی ہوگی

کہیں ہمارے جنوں کو نج اٹھی ہے سر فلک
سکوت میں کوئی زنجیر بج اٹھی ہوگی

تری غزل ہے جنوں کی گو ترجمان کلیم
مگر جہاں کے لئے اس میں آگہی ہوگی

علاّمہ گردش نے آپ کا یہ شعر دہرایا :

بڑی ہے جان بپت نگوں کے قافلوں میں نئی
کسی چراغ کی لو تیز ہو گئی ہو گی !

پھر کلیم صاحب نے دوسری غزل سنائی :-

پھول ہر کوئی گلستاں کا جواں ہے اب تک
پھر یہ احساس ہے کیوں! دورِ خزاں ہے اب تک
میرا پیکر ہے کہ تصویر ہے کوئی جب
بند لب ہیں مرے خاموش زباں ہے اب تک
کیا ہی بہتر ہو اسی درد کو تسکین کہوں !
ہر نفس ور دنیا در پئے جاں ہے اب تک
میری منزل کو بہت دیر سے ہے اس کی تلاش
کارواں میرے تجسس کا کہاں ہے اب تک
نام تسکین بھی نہیں کوئی نفس دنیا میں
ہر قدم پہ یہاں وحشت کا گماں ہے اب تک
یاد میں تیری کبھی شعلہ بداماں دل تھا
وہی خاموش فضاؤں میں دھواں ہے اب تک
اُن سے امیدِ عنایاتِ وفا کیا ہو کلیم
مسکرانا بھی انھیں بارِ گراں ہے اب تک

جنابِ گردش نے کہنا شروع کیا :

مسکراتا ہے جب کوئی منظر
زندگی کا خیال آتا ہے

یہ وہ شاعر ہے جس کی ذات میں بس کی صفات ہیں اور جس کی بات بات میں ہمیں تبسم ہی تبسم نظر آتا ہے۔ میرا مطلب جناب تبسم رشید صاحب ہے۔ سیدھے سادھے الفاظ میں شعر کہنے کے عادی ہیں۔ آپ پریس کے مالک ہیں۔ اردو کی خدمت میں ہر وقت کوشاں رہتے ہیں۔ چند دنوں میں ہمارے شہر سے ایک پندرہ روزہ پرچہ نکالنے والے ہیں۔

سیاہ اور سفید لنگی میں ایک صاحب گہرے سانولے رنگ کے مالک ہیں اور دھیمی آواز میں غزل سنانے لگے۔ ایک ہاتھ میں کاغذ تھا اور دوسرا ہاتھ پیٹھ کے پیچھے تھا۔ کبھی کبھی کاغذ والا ہاتھ بھی پیچھے پہنچ جاتا تھا۔

"تری نظر نے سلیقے سے گفتگو کی ہے"
خیال و خواب کی دنیا کو زندگی دی ہے
کسی کا نقش کفِ پا جہاں بھی ہم کو ملا
نظر سے چوم کے ہم نے جبیں جھکا دی ہے
ہجومِ درد کو دے اور وسعتیں یا رب
رہِ حیات میں کچھ اب کمی کمی سی ہے
تری طرف سے ظہورِ کرم نہیں نہ سہی
ترے کرم پہ مجھے اعتبار پہلی ہے
تمام رات ترے حسن کے تصور میں

جلا کے داغِ جگر ہم نے روشنی کی ہے

سرور بادۂ افرنگ اب نہیں لیکن

دماغ اہلِ وطن میں خمار باقی ہے

پھر تبسم صاحب نے اپنی دوسری غزل سنائی :-

کوئی مہر و ماہ سے گذر گیا، کوئی کہکشاں سے گذر گیا

یہ کمال تھا مرے ذوق کا، غم دو جہاں سے گذر گیا

غم زندگی ترے روبرو، غم عاشقی کا ہجوم تھا

میں نظر بچا کے دبے دبے یونہی درمیاں سے گذر گیا

مجھے حادثوں کا ہو خوف کیا، مجھے رنج و حزن و ملال کیا

میں تو حادثوں سے بھی کھیلتا، درِ دشمناں سے گذر گیا

جہاں قافلے بھی پلٹ گئے، جہاں ختم راستے ہو گئے

یہ جنون تھا مرے شوق کا کہ میں اس نشاں سے گذر گیا

یہ تو اپنے ظرف کی بات ہے ذرا سن اے واعظِ بے خبر

تو جہاں جہاں بھی ٹھہر گیا، میں وہاں وہاں سے گذر گیا

تو مرے ہی دل میں مکیں رہا، مجھے اس کی کوئی خبر نہیں

ترے نقشِ پا کی تلاش میں کہاں کہاں سے گذر گیا

پھر گردش نے کہا :-

سمجھ سکے ہیں نہ سمجھیں گے یہ جہاں والے

میں وہ سوال ہوں جس کا کوئی جواب نہیں

یہ سوال حضرت صبا ہیں۔ عبدالرحمان صبا۔ اسلامیہ کالج کے انگریزی ٹیوٹر ہیں۔ انگریزی اودو اور ٹمل میں مہارت حاصل ہے۔ غزل سے زیادہ نظم کے شاعر ہیں۔ دس دس صفحوں کی نظمیں لکھنا ان کے لئے آسان ہے خواہ پڑھنے والے پڑھیں یا نہ پڑھیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ تشریف لائیں اور اپنی کوئی نظم سنائیں

صبا صاحب تشریف لائے۔ آپ انگریزی ٹیوٹر سے زیادہ جھگڑے کے تاجر لگ رہے تھے۔ سفید لنگی، سفید شرٹ، سر کھلا ۳۵ کے قریب عمر چلنے کا انداز ایسا جیسے کسی باغ میں تفریحاً ٹہل رہے ہوں، آپ نے نظم سنائی:

ساقیا! جام بڑھا، جام بڑھا، جام بڑھا
ہاں پلا، خوب پلا، خوب پلا، خوب پلا
چھین لے ہوش مرا، تو مجھے مدہوش بنا
لا پلا، اور پلا، اور پلا، اور پلا
آج ہے درد سوا — آگ لگتی ہے ہوا
خار ہے موجِ صبا — ایک برچھی ہے فضا
تاب سہنے کی نہیں
بات کہنے کی نہیں — لا پلا خوب پلا
ایک سوکھی سی کلی — غم کے سانچوں میں ڈھلی
زندگی جو بھی ملی — موت کے گرد چلی
ایک خاموش کراہ — ایک کربناک گناہ

لا پلا، خوب پلا ......

ایک سر تا پا جمال　　اک چمن زارِ جلال
جنون انگیز سوال　　آپ ہی اپنی مثال
وہ تصور ہے وبال　　آتش ستانِ خیال

لا پلا، خوب پلا ....

میں کہیں دور چلا　　ہو کے مجبور چلا
لے گئے ناسور چلا　　کتنا رنجور چلا
ٹیس دبتی ہی نہیں　　آہ رکتی ہی نہیں

لا پلا، خوب پلا ......

اک پرستاں تھا جہاں　　نرگس ستاں تھا جہاں
اک گلستاں تھا جہاں　　اک خم ستاں تھا جہاں
اب وہ احساس نہیں　　زندگی راس نہیں

لا پلا، خوب پلا ....

زندگی پیچھے ہٹی　　موت کترا کے چلی
ایک بھی مل نہ سکی　　ہائے تقدیر مری
میں کہاں جا کے رہوں　　اتنے غم کیسے سہوں

لا پلا، خوب پلا، ....

یہ سیہ بختی مری　　یہ مری نالہ زنی
میری آشفتہ سری　　مرے مژگاں کی تری

سب اتری نذر کروں تیرے قدموں پہ دھروں

لا پلا، خوب پلا، ....

چاہے ہونٹوں سے پلا چاہے آنکھوں سے پلا
چاہے ہاتھوں سے پلا چھوٹے جاموں سے پلا

تو بہر طور پلا مجھ کو مدہوش بنا

چھین لے ہوش مرا
چھین لے ہوش مرا

ساقیا جام بڑھا، جام بڑھا، جام بڑھا، جام بڑھا

غالباً غالب صاحب کو صبا صاحب کی پر سوز آواز میں نیند آگئی تھی، وہ بیٹھے تھے اور آنکھیں بند تھیں۔ پھر انہوں نے جھک کر گردش صاحب سے کچھ کہا۔ گردش صاحب نے ایک بازو والے کو بلا کر کچھ کہا: اور فوراً ایک سوڈے کا شیشہ لایا گیا۔ اور غالب کے سامنے گلاس میں انڈیل کر رکھدیا گیا۔

گردش صاحب نے پھر کہا: ؎

تم نہ ہو ، دم جفاؤں پر ہونا
مجھ کو عادت ہے بھول جانیکی

یہ بھول جانے والی صاحبہ نعیمہ پرویز ہیں۔ بزم نو کے ہر مشاعرے میں آپ کی غزل سنائی جاتی ہے۔ شمال کے رسالوں میں آپ کا کلام شائع ہوتا ہے۔ بلند خیالات اور پاکیزہ جذبات آپ کی شاعری کے سہارے ہیں۔ تبسم صاحب آپ کا کلام سنائیں گے۔ ؎

گوہر اشک زیبِ دامن ہے زندگی اس سے میری روشن ہے
کرلو نظارہ اے جہاں والو برق کی زد میں میرا خرمن ہے
داغہائے کہن نکھر جاؤ سونا سونا سا دل کا آنگن ہے
جیتے جی کیسے چھوڑ دوں ناصح شاعری میرے دل کی دھڑکن ہے
کسی صحرا میں جا بسیں گے ہم آشیاں اپنا بارِ گلشن ہے
مجھ کو اپنے گناہ کا کیا غم رحمتِ باری سایہ فگن ہے
دفن کتنی ہی آرزوئیں ہیں یہ خموشی بھی گویا مدفن ہے

دل پرویز جس کو کہتے ہیں
گہرِ اخلاص کا وہ مخزن ہے

پھر دوسری غزل سنائی گئی:

وہ زندگی بھی بھلا کیسی زندگی ہوگی جو تیری یاد سے خالی گزر رہی ہوگی
خوشی کے جلوے محبت کی چاندنی ہوگی تمہارے در پہ بھلا کونسی کمی ہوگی
بھلا چمن میں کہو کون سی کلی ہوگی جو رنگ و روپ میں تم سے بڑھی ہوئی ہوگی
جسے تو چاہے دے دردِ دل و سکونِ دل تمہارے خزانے میں کس چیز کی کمی ہوگی
کہ جب کہ ہم کوئی تدبیر سوچتے ہوں گے تو دور پہ کھڑے تقدیر ہنس رہی ہوگی
میں وہ ہوں تجھ کو پتہ بھی ہے راہبر میرے کہ مری راہ تو منزل بھی دیکھتی ہوگی

وہ آج کل ہیں مہرباں تجھ پہ اے پرویز
تری ریاضتِ دل رنگ لا رہی ہوگی

پھر گردش نے کہا:

گمرہی کا مجھے نہیں خطرہ
غائب سے مجھ کو hints ملتے ہیں
راہ میں آگے آگے قدموں کے
خضرؑ کے foot prints ملتے ہیں

یہ جناب اختر ہیں مختار احمد اختر گریجویٹ ہیں۔ اردو سے زیادہ انگریزی جانتے ہیں، اور ان دونوں زبانوں کا اس طرح سنگم بناتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسا کوئی نیگرو سفید فام لڑکی سے عشق لڑا رہا ہے۔ یا یہ پانی کے ساتھ زردہ ملا ملا کر کھایا جا رہا ہے سنجیدہ خیالات کو انگریزی قافیوں کے سہارے کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ سننے والا کھل کھلا اٹھتا ہے۔ فن کا یہ کمال انھیں کا حصہ ہے۔

مختار احمد اختر اسٹیج پہ Reach ہو گئے۔ میں نے دیکھا آپ متوسط جسامت رکھتے ہیں۔ چہرے پہ سب سے نمایاں چیز آپ کی ناک تھی جسے حیرتِ ناک بھی کہہ سکتے ہیں۔ چہرے پہ داڑھی، کھلا رنگ۔ آپ نے اپنی ناک سے ہی مائک درست کر کے کچھ قطعات سنائے:

زمانہ بور کھاتا ہے پرانی داستانوں سے
چلو ان لاہ لاہ افسانوں کی TOPIC change کرتا ہوں
دلِ محفل بہل جائے، ذری تفریح ہو جائے
میں اپنی شاعری کی آن technique change کرتا ہوں

تجھ کو جینے کی گر تمنا ہے !
زندگی کا ground پیدا کر
سرد آہوں سے کچھ نہیں ہوتا
اپنی آہوں میں sound پیدا کر

سر پہ مردوں کے hand عورت کا
ہر قدم پہ command عورت کا
کیا نرالے ہیں کھیل دنیا کے
ناچ مردوں کا band عورت کا

حوصلے پائمال ہوتے ہیں
ان کا جب بھی خیال کرتا ہوں
رہتی ہے engage انکی
جب بھی میں ان کو call کرتا ہوں

میری نظروں نے آج کیا دیکھا
جام ٹیڑھا ہے wine ٹیڑھی ہے
صاف گوئی معاف ہو ساقی
تری counters پہ line ٹیڑھی ہے

رات کھائے تھے ان کے گھر dinner
چھوڑو یہ سب ہیں Past کی باتیں
صبح آئی ہے اب امیدوں کی
کچھ کرو break fast کی باتیں

تیرہ بختی اپنی تم سے کیا کہوں !
اب جاتی رہی Shining کی Boot
سلوٹوں میں گردش ایام کی
بھی اب جاتی رہی lining کی suit

سازِ غم ہم نے ایسے چھیڑے ہیں
دل کی Spring، shake ہوتی ہے
شب کی آہوں سے دن کے نالوں سے
ساری building، Shake ہوتی ہے

ہم نے مانا شاعری اک Fondemental right ہے
تم اتنی ہی ملیگی جسکی جتنی Right ہے might
ہر قدم پر زندگی میں ہم کو ناکامی ہوئی!
ہم کریں کیا جب کہ اپنا قافیہ ہی tight ہے

پھر اختر صاحب سے غزل کی فرمائش ہوئی : اختر صاحب سنانے لگے : ص

ہجر کی شب کا pain مت پوچھو
وصل کی شب کا gain مت پوچھو

پردہ اٹھتا ہے ، پردہ گرتا ہے
واقعہ کیا ہے [illegible]ain مت پوچھو

ان کے ابا سے مِل کے آیا ہوں
بات کیا تھی plain مت پوچھو

اپنی منزل عدم کی بستی ہے
آئے گی کب train مت پوچھو

چھوڑ آتے ہیں گھبر یہ جب چھتری
کیسی ہوتی ہے [illegible]ain مت پوچھو

حالِ دل جانتے ہیں سب اختر
مت پوچھو condition of brain

اور ایک غزل سنانے لگے : ص

فیشن کے قمقموں سے ہے عالم سجا ہوا
بربادیوں کا جال ہے ہر سُو بچھا ہوا
تخئیل کے چمن میں ہے کرفیو لگا ہوا
ہے فکر بھی خموش، قلم بھی رُکا ہوا
اک cyclone غم کا ہے دل میں دبا ہوا

اشکوں سے ہے حیات کا ساغر بھرا ہوا
پژمردہ ہے نگاہ بھی، دل بھی بجھا ہوا
ہے capital حیات کا سارا لٹا ہوا
میخوار بدحواس ہیں، سہمے ہوئے ہیں جام
پیرِ مغاں کا آج ہے temper چڑھا ہوا
welcome سمجھ کے شیخ جی اندر چلے گئے
No Admission کا بورڈ تھا باہر لگا ہوا
یوں خستہ حال bottom سے top تلک ہوئے
دستار تار تار ہے جوتا پھٹا ہوا
اب تیری خودسری کی مجھے care کچھ نہیں
گر تو نہیں بلا سے، کوئی دوسرا ہوا
تیرے ہی ہاتھ فیصلہ ہے میرے case کا
اختر کا حال تجھ سے نہیں ہے چھپا ہوا

ایک اور غزل:

ترے روشن خیالوں کو cloudy کر کے چھوڑوں گا
تری ہر ہر غزل کی میں Parody کر کے چھوڑوں گا
اڑا کر خاک میں جوشِ جنوں میں دشت و صحرا کی
فضائے صفحۂ ہستی کو dusty کر کے چھوڑوں گا
میں دیوانہ سہی، میرے جنوں کی خیر ہو یارب

میں فرزانوں کو اک پل میں crazy کر کے چھوڑوں گا

مری قسمت اگر صحرا نشیں ہے تو کیا غم ہے
میں صحراؤں کے ہر ذرّے کو shiny کر کے چھوڑوں گا

فسانہ زیست کی غم ناکیوں کا شارٹ کیا لکھوں
جو قصہ مختصر ہو اس کو lengthy کر کے چھوڑوں گا

ہے مجھ کو آگہی دشواریوں سے راہِ الفت کی
جو مشکل پیش آئے اس کو easy کر کے چھوڑوں گا

دلِ ناداں تجھے اس خواب کے محلوں سے کیا حاصل
میں ان محلوں کے فونڈیشن کو sheky کر کے چھوڑوں گا

حقیقت کو نچوڑونگا کبھی دھندلے فسانوں کی
کبھی روشن حقیقت کو dreamy کر کے چھوڑونگا

خوشی کا ایک انٹروَل اگر مِل جائے ہستی میں
دلِ محفل کو اختر اور merry کر کے چھوڑونگا

علّامہ گردشؔ نے کہا:

وسعتیں اس کے دل کی کیا جانیں
جس کے سینے میں درد پلتا ہے

یہ عبداللطیف نفیسؔ ہیں۔ کھیل کود سے انھیں شوق ہی نہیں بلکہ یہی ان کی ڈیوٹی بھی ہے۔ ہائی سکول کے P.E.T ہیں۔ اشعار لکھنے میں اس احتیاط سے کام لیتے ہیں کہ درمیان میں کہیں ہاکی اور

کرکٹ کا نام نہ آنے پائے، ورنہ فول ہو جانے کا اندیشہ ہے:

ایک کم عمر بھولی بھالی صورت اور معمولی جسم والے ہیں
سی مونچھیں والے صاحب مائک پر نظر آئے۔ آپ نے غزل سنائی: ۵

مرے دل کا چراغ جلتا ہے — حسن تیرا جہاں پگھلتا ہے
اپنے رُخ سے نقاب اٹھاؤ تم — وقت سے پہلے چاند ڈھلتا ہے
انکو بھولے ہوئی اک عمر مگر — جانے دل آج کیوں مچلتا ہے
وسعتیں اس کے دل کی کیا جانیں — جس کے سینے میں درد پلتا ہے

ٹھوکروں کی نفیس فکر نہ کر
جو بھی گرتا ہے وہ سنبھلتا ہے

پھر آپ نے دوسری غزل سنائی: ۵

ہم جی رہے ہیں عشق کا سودا لئے ہوئے — وہ پھر رہا ہے حسن کی دنیا لئے ہوئے
غم جو ملا ترا تو جہاں بھر کا غم ملا — یہ دل مرا ہے وسعتِ دریا لئے ہوئے
سلجھا کے تیری زلف کو جانا ہے آج — دامن میں ہے حیات بھی کیا کیا لئے ہوئے
فصلِ بہار آئی مگر گل نہ کھل سکے — پہلو میں دل ہے آج بھی صحرا لئے ہوئے

دل بھی گیا نفیس مرا بزمِ ناز میں
اس کی نگاہِ ناز کا جرگہ لئے ہوئے

گردش صاحب نے کہا: ۵

ہم تیری جستجو میں کہیں اور کھو گئے
جو تیری راہ تھی وہ نہ جانے کدھر گئی

یہ جناب سائل ہیں (شاہد احمد سائل) آپ آئیں اور اپنی غزلوں سے نوازیں :

ایک گھریلو سانولے رنگ کے آدمی، داڑھی کے قومی لباس سفید لنگی، سفید قمیص اور ٹوپی میں آئے اور غزل سنانے لگے ؛

شانوں پہ میری زلف جو تیری بکھر گئی
قسمت کی بات تھی مری قسمت سنور گئی

ہم تجھ کو بھول جائیں یہ ہمت نہ کر سکے
تصویر تیری دل میں ہمارے اتر گئی

ملنے کی بات تھی کہ ملے پھر نہ مل سکے
ہم کو تیری نگاہ پریشان کر گئی

ہم تیری جستجو میں کہیں اور کھو گئے
جو تیری راہ تھی وہ نہ جانے کدھر گئی

سائل نہیں ہے اب مجھے شکوہ نصیب کا
"اچھی بری گذرتی تھی جیسی گذر گئی"

پھر انھوں نے دوسری غزل سنائی ؛

میں یقیں کی راہ پہ آگیا جو کبھی گماں سے گذر گیا
یہ ہے حوصلہ مرے عشق کا کہ ہر امتحاں سے گذر گیا

میں کبھی بلندیوں سے گذر گیا کبھی آسماں سے گذر گیا
جہاں رفعتوں کے بھی پر جلیں، ہر اس آستاں سے گزر گیا

کبھی چاند سے بھی پرے اڑا کبھی کہکشاں سے گذر گیا
جو ترے خیالوں میں چل پڑا وہ کہاں کہاں سے گذر گیا

رہِ زندگی کے یہ مرحلے غمِ عاشقی کے یہ حادثے!
یہ خلوصِ دل کا ہی فیض تھا میں غمِ جہاں سے گزر گیا

اے خزاں میں تیری ہوں ہم نفس میں ترا اسائلِ بے نوا
اب اُگ گئے ہیں خار وہاں وہاں میں جہاں جہاں سے گذر گیا

اس دوران ایک چیٹھی کئی ہاتھوں سے گزرتی ہوئی گردش صاحب کے پاس پہنچی۔ یہ شاید کسی مزاحیہ شاعر کے لئے فرمائش رہی ہوگی مگر گردش صاحب کے چہرے کا رنگ غصّہ سے سرخ ہو گیا تھا۔ انھوں نے چیٹھی پھاڑ کر ایک طرف پھینک دی۔ حقیقت بعد میں معلوم ہوئی کہ چیٹھی کسی منخرے نے ٹمل زبان میں لکھ بھیجی تھی۔

گردش نے پھر کہنا شروع کیا۔ اب اس نوجوان شاعر کو سنیئے جو کہتا ہے :

ترے تھانے میں وہ لذت ملی ہے
کہ پھر لڑکھڑانے کو جی چاہتا ہے

یہ محمد غوث خاتم ہیں بی کام کے طالب عالم دانمباڑی کے نوجوان اور ابھرتے ہوئے مشاعروں میں اسیے ہیں۔

ایک بالکل کم عمر کھلے رنگ کا نوجوان شاعر مائک پر غزل سنانے لگا۔

غزل کے کچھ شعر یہ تھے :۔

گلے سے لگانے کو جی چاہتا ہے
جنوں پھر جگانے کو جی چاہتا ہے

کہ جیسیں ہوا ہوں کا طوفان پیہم
وہ نغمہ سنانے کو جی چاہتا ہے

ترے تھامنے میں وہ لذت ملی ہے
کہ پھر لڑکھڑانے کو جی چاہتا ہے

بھروسہ نہیں آج کل تیرا خاتم
تجھے آزمانے کو جی چاہتا ہے

پھر آپ نے دوسری غزل سنائی :۔

میں جنونِ عشق میں دوستو یہ کہاں کہاں سے گذر گیا
مجھے جس مکاں کی تھی جستجو میں اسی مکاں سے گذر گیا

نہ پتہ چلا نہ ملا کہیں مجھے اب بھی ہے تیری جستجو
ترے گلستاں کی تلاش میں تیرے گلستاں سے گذر گیا

مجھے اس نے دیکھا کفن میں جب تو لبوں پہ راز یہ آ گیا
جو تھا آج تک مرا راز داں وہ تو اِس جہاں سے گذر گیا

پھر علامہ گردش نے کہا :۔

جو حقیقت سے دور تھے کوسوں
ہم نے ایسے بھی خواب دیکھے ہیں

پھر کہا۔ شاید آپ سمجھ رہے ہونگے کہ اس شعر کا خالق بھی شعر ہی کی طرح خوبصورت اور مختصر ہوگا، لیکن میں کہتا ہوں کہ یہ وہ آدمی ہے جس کے آجانے سے یوں لگتا ہے جیسے محفل میں کئی آدمی آگئے ہیں۔ اور جس کے چلے جانے سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کئی آدمی اٹھ کر چلے گئے ہیں۔ لیکن یقین مانئے ان کے آنے اور چلے جانے سے مشاعرے کی اصلیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ زیادہ کہنے کے وقت نہیں ہے۔ اس دیو قامت جوان شاعر کو ملک یوسفی کہتے ہیں۔ ہزاروں کے مجمع میں انہیں ڈھونڈ نکالنا مشکل کام نہیں ہے۔

اور میں نے دیکھا کہ واقعی ایک قوی ہیکل لڑکا آیا جس کے لئے مائیک کی اونچائی ناکافی رہی۔

انہوں نے عید کے متعلق ایک نظم شروع کر دی:۔

عید پھر ایک بار آئی ہے ۔ میری یادوں میں تم چلے آؤ
میری نظروں سے دور ہو لیکن ۔ میرے خوابوں میں تم چلے آؤ
یوں تو عیدیں ہزار آتی ہیں ۔ کوئی میرے لئے نہیں آئی
عید و تہوار کوئی چیز نہیں ۔ میں نے ایسی ہی زندگی پائی
جب تمہارا خیال آتا ہے ۔ اشک پیتا ہوں جام کے بدلے
دن تو روشن کبھی نہیں ہوتا ۔ رات آتی ہے شام سے پہلے

تم کو شاید پتہ چلا ہوگا کیسی ہوتی ہے ہجر کی راتیں
آنکھ ہوتی ہے کس طرح پرنم یاد آتی ہیں جب ملاقاتیں
پاس میرے جو تم چلے آؤ
ہم مزے کے دن منا لیں گے
آج بھی تم اگر چلے آؤ
عید ہم اور تم منا لیں گے

انادونسر نے پھر کہا:۔

محبت میں تمہارے ہو گئے ہم سر سے پاؤں تک
یہ ٹوپی بھی تمہاری ہے یہ جوتا بھی تمہارا ہے

یہ عتیق جاذب ہیں بیچارے گریجویٹ ہیں اور سنا ہے کچھ تجارت بھی کرتے ہیں خود ہنستے ہیں دوسروں کو ہنساتے ہیں سیدھے سادھے انسان ہیں، پشاور تک تو مسلمان ہیں، پیشانی سے او پر مسلمانیت نظر نہیں آتی کیونکہ سر منڈھا ہوا ہے اور نہ سر پر ٹوپی (جو داڑھی کے مسلمانوں کے مسلمان ہونے کی علامت ہے) غزل سناتے وقت آپ نہ صرف زبان کا استعمال کرتے ہیں بلکہ ہاتھ اور پیر سے بھی کام لیتے ہیں۔ اور سب ملا کر کچھ اتنا ادھم مچاتے ہیں کہ بے اختیار مشاعرہ گاہ

ہے۔ فرار ہو جانے کو دل چاہتا ہے۔ انہیں اکثر مشاعروں میں وقفہ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے اپنے چند لوگوں کو اس بات پر آمادہ کر لیتے ہیں کہ وہ ہر شعر میں مکرر ارشاد کی گونج سے مشاعرہ کی فضا مکدّر کریں

ایک جوان العمر سانولے رنگ کا شاعر مہین داڑھی سر کھلا ہاتھ میں لال ڈائری لئے مائیک پر آیا اور پہلے کچھ قطعات سنانے لگا :-

دل کا ہر زخم ایک شعلہ ہے
شعر بن کر جو یوں لپکتا ہے
مائک پر جب کبھی میں گاتا ہوں
لاؤڈ اسپیکر سے خون ٹپکتا ہے

وہ ہم کو خط جو لکھتے ہیں تو انگریزی میں لکھتے ہیں
بہت ہی مختصر لکھتے ہیں جب جلدی میں لکھتے ہیں
مگر خطوں میں محبت کا جہاں بھی نام لیتے ہیں
قلم کو Ink کے بدلے ڈبو کر گھی میں لکھتے ہیں

جنابِ شیخ کا شوقِ سینما
ہر اک ہفتے میں دو دو دیکھتے ہیں
نمازوں کی بھی پابندی ہے قائم
عشاء پڑھکر سکینڈ شو دیکھتے ہیں

پھر جاذب نے چند قطعات سنائے جو سرکاری لاٹری کے متعلق تھے۔ ان میں جدا جدا انسانوں کے خیالات پیش کئے گئے ہیں۔

ایک بھکاری

میں بھکاری سہی مگر لوگو
لاٹری لگ گئی تو بتلا دوں
تم سے مانگا ہے آج تک جتنا
ایک اک پائی گن کے لوٹا دوں

جواری

زندگی بھی تاش کا اک کھیل ہے
جیت ہے اسکی جسے جوکر ملے
ساری دنیا کو نچا کر چھوڑ دوں
لاٹری کا گر مجھے نمبر ملے

سود خوار

لاٹری میرے نام آجائے
میں یہ دولت ابھی نہیں لونگا
صرف ہر ماہ سود لے لونگا
لاکھ روپیہ کبھی نہیں لونگا

انجام

گر خدا مجھکو لاٹری دیدے
کتنے بھوکوں کو میں کھلاؤنگا
اپنے گاؤں کے سارے لوگوں کو
تین دن تک Free ملاؤنگا

شاعر

زندگی اپنی زہر ہے لیکن
اور ہم گھونٹ پی تو سکتے ہیں
یہ امیدیں بھی اک فریب سہی
ان امیدوں پہ جی تو سکتے ہیں

عاشق

تیری یادوں کا خون ہو جس میں
ایسی خوشیوں سے غم ہی اچھے ہیں
مجھکو یہ لاٹری سے ملے بھی کیوں
میں نے کونسے ٹکٹ خریدے ہیں

مولوی

لاٹری حق کے نام آئی ہے
پیارے روپیے عوام کے لینگے
ایک روپیہ حلال کا دیکر
لاکھ روپیے حرام کے لینگے

پیر و فقیر

کونسی کھیل لاٹری یہ چلتا ہے جہاں
رنگ کیوں اپنے بدلتا ہے جہاں
جب کبھی دیتا ہے کسی کو کچھ خدا
دیکھکر کیوں اسکو جلتا ہے جہاں

پھر جاذب نے ایک نظم سنائی جس کا عنوان تھا
"قرض کی داستاں"

ہے زمانے کی ہر چیز فانی مگر
قرض لینے کے دکھ درد فانی نہیں
جو بھی گزرا ہے خود پر سناتا ہوں میں
یہ حقیقت ہے کوئی کہانی نہیں

قرض کے مجھکو وہ حادثے یاد ہیں
آج بھی وہ حسیں تجربے یاد ہیں

میں نے اک ڈاکٹر سے کہا مہرباں،
ٹمپریچر مرا بڑھ گیا ناگہاں
جیب میں ہے نہ پیسوں کا نام و نشاں
قرض دیجیے دوا آج اے مہرباں
سننکے کہنے لگا شوق سے لو یہاں
پھر وہ سوئی چبھوئی کہ بس الاماں

جس پہ سوے کا ہوتا تھا مجھکو گماں
آج بھی میرے بازو پہ ہے وہ نشاں
رفتہ رفتہ مرض میرا بڑھتا گیا
میرے پہ قرضہ دوائی کا چڑھتا گیا

ایک دن ایک حجام د دکان پر
تھا مرے سر پہ مصروف سب چھوڑ کر
آدھا سر مونڈ ڈالا تھا اس نے مگر
میں نے جب یہ کہا اپنا دل تھام کر
چھوڑ آیا ہوں پیسے میں گھر پہ ڈیئر
کہہ دیا ہنس کے لا دو جب آؤ ادھر
پھر نیا استرا رکھ کے اسٹینڈ پر
زنگ آلود اک استرا لے لیا
مجھکو حجام نے اک سبق دیدیا

ایک دن ایک مہمان گھر آگیا
اس مصیبت پہ سر میرا چکرا گیا
خوف بڑھتا گیا اور بخار آگیا
میری حالت پہ مہماں بھی گھبرا گیا
جسقدر اپنے مہمان بڑھتے گئے
قرض کے ہم پہ احسان بڑھتے گئے

اک مرے دوست تھے جنکی شادی ہوئی
قرض لے کے ساری تیاری ہوئی
ہوگئی قبر جیسی بھی ، اچھی ہوئی
آرزو ابکے والد کی پوری ہوئی
دن گذر نے لگے عمر آدھی ہوئی
پانچ بچوں کی ماں ان کی بیوی ہوئی
پھر بہراں چیز اللہ کی دی ہوئی
قرض کے ساتھ اولاد بڑھتی ہوئی

قرض کی ختم ہوتی ہے کب داستاں
قرض کی داستاں ہے عجب داستاں

پھر جاذب نے ایک غزل سنائی :—

زمیں گھس گئی آسماں گھس گیا
مرے دل میں سارا جہاں گھس گیا
مرے دل میں کیا آپ کا غم گھسا
کہ منزل میں اک کارواں گھس گیا
جلا تھا مرا دل تو کچھ غم نہ تھا
تری ناک میں کیوں دھواں گھس گیا

ہماری جبیں پر جو اک داغ سا ہے
اسی میں ترا آستاں گھس گیا

دبے پاؤں تاریک تنہائی میں
مرے گھر میں اک میہماں گھس گیا

گماں میں بھی تھوڑا یقیں مل گیا
یقیں میں بھی تھوڑا گماں گھس گیا

جہاں شکل دیکھی تری مانگ کی
وہاں جلوۂ کہکشاں گھس گیا

میری مئے کی بوتل جو خالی ہوئی
تو بوتل میں پیر مغاں گھس گیا

کئی میکدے ہیں گلی میں تری
یہ جاذب نہ جانے کہاں گھس گیا

پھر جاذب نے دوسری غزل شروع کی لیکن میں نے محسوس کیا کہ غالب صاحب بیٹھے بیٹھے غائب ہو گئے ہیں۔ میں نے غور سے دیکھا تو وہاں گردش نظر آئے نہ اسٹیج نہ محفل البتہ میرے سر کے قریب ریلوے کمپارٹمنٹ کا پنکھا تیزی سے گھوم رہا تھا۔ میں پوری طرح جاگ پڑا۔

دیکھا کہ ٹرین کسی اسٹیشن پر رکی ہوئی ہے۔ لوگ سامان سنبھالے
اتر رہے ہیں۔ میں وانمباڑی سے بہت دور بنگلور پہنچ گیا تھا۔

ختم شد۔

مزاحیہ قطعات

اختر و جاذب

کے

سَو سے زیادہ مزاحیہ و طنزیہ قطعات

بہت جلد کتاب کی شکل میں

شائع ہونے والے ہیں۔

قہقہے

آپ کیلئے تحفہ

دلچسپ اور نایاب

لطیفوں کا ایک مجموعہ

بہت جلد آرہا ہے

انتظار کیجئے